(سلسلۂ انجمنِ ترقیٔ اردو نمبر ۴۹)

2-3

دیوانِ یقین

مرتبّہ

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے

اسسٹنٹ ہوم سکرٹری ریاست حیدرآباد (دکن)

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبع ہوا
۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء

ایک ہزار

طبع اوّل
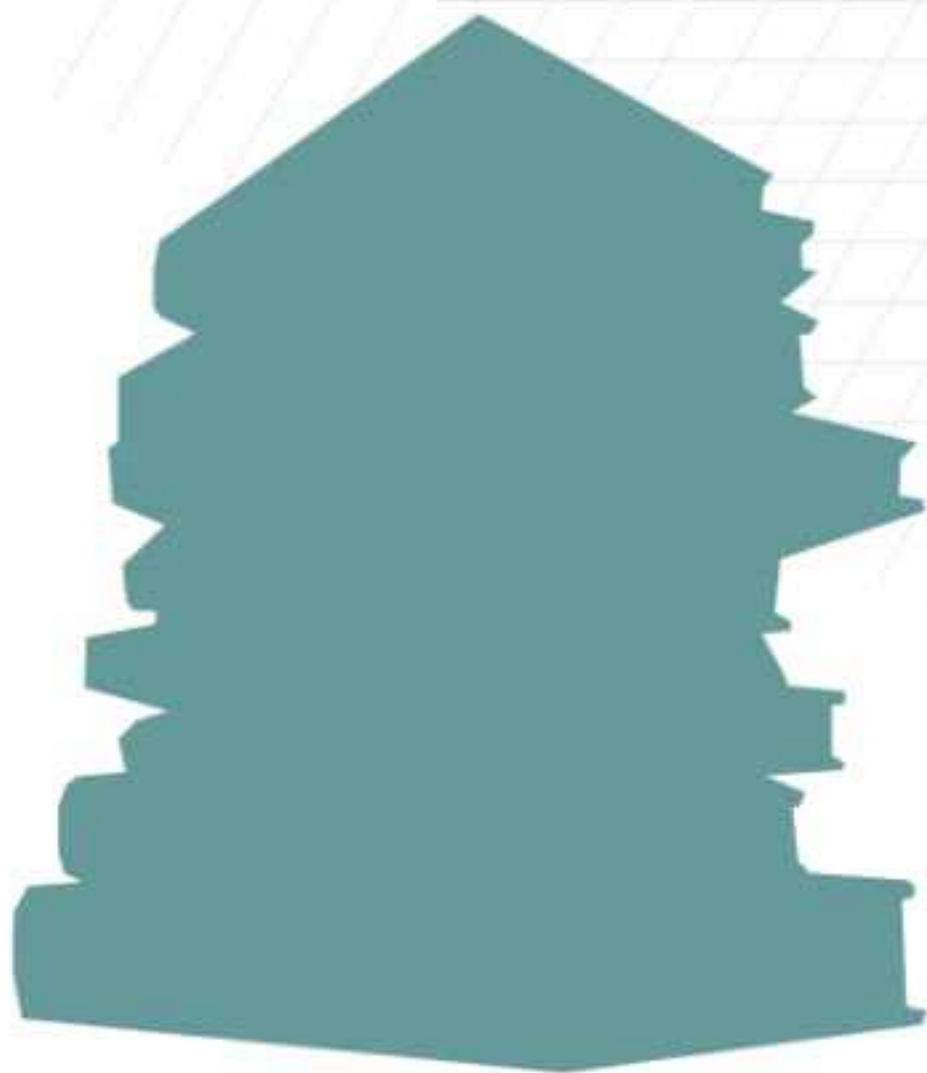
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہے یہ کہ جو بات ہونے والی ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ بھلا مجھکو دیکھو اور انعام اللہ خاں یقین کے دیوان کی تصحیح اور طبع کرانے کو دیکھو۔ اس کے لئے کتب خانے کی، وسعتِ نظر کی، علمیت کی، شاعری کی اور سب سے زیادہ فرصت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ کچھ تھوڑی بہت کتابیں تھیں ان کو دیمک نے کھا کر برابر کر دیا۔ شاعری سرکاری نوکری کے نذر ہو گئی۔ اب رہی فرصت تو اُس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملازمت اور فرصت دو متضاد لفظ ہیں۔

اب دیکھئے کہ یہ سلسلہ چھڑا کیوں کر۔ میں دیوان تاباں نواب سالار جنگ بہادر [illegible] سے لا کر نقل کر رہا تھا اسی جلد میں دیوان یقین بھی تھا۔ کبھی کبھی اس پر بھی [illegible] خدا معلوم یہ شعر کیوں کر یاد رہ گیا ہے

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیں
ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے یہ شعر میں نے غلام یزدانی صاحب کے سامنے پڑھا۔ ان کو بہت پسند آیا۔ کہنے لگے۔ "مرزا صاحب! یہ شاعر تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں بڑی شیرینی ہے۔ اس پر کچھ لکھ ڈالو"۔ خبر نہیں کہ ان کا یہ کہنا اتنا کیوں اثر کر گیا کہ رات بھر اسی دھن میں لگا رہا کہ کب صبح ہو اور کب دیوان یقین جا کر لاؤں۔ صبح ہوتے ہی نواب سالار جنگ بہادر کے پاس عرض کرائی کہ چند روز کے لئے دیوان یقین دے دیجئے۔ نواب صاحب کو خدا اچھا رکھے کچھ عجب علم دوست شخص واقع ہوئے ہیں، ایک چھوڑ دو، دو دیوان بھیج دیئے۔ ان کا کچھ حصّہ پڑھا۔ اس سے شوق اور بڑھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کو خط لکھا۔ خدا جانے جوش میں کیا کیا لکھ گیا۔ انھوں نے دیوان یقین کے تین قلمی نسخے بھیجے۔ مگر ساتھ ہی میرے خط کے الفاظ کی شکایت کی۔ میں نے معذرت کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ تین نسخے کتب خانۂ آصفیہ میں ملے۔ دو نسخے آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج سے لئے۔ تین نسخے مولوی عمر یافعی صاحب نے لا کر دیئے۔ غرض دو اور تین پانچ اور تین آٹھ اور دو دس اور تین تیرہ نسخے مل گئے ان میں ایک نسخہ مطبوعہ تھا، بنگلور میں چھپا تھا۔ اس میں اوّل تو غزلیں کم ہیں، دوسرے غلطیاں بہت ہیں۔ بہرحال دیوان کی ترتیب و تصحیح کے لئے کافی مواد ہو گیا۔ اس کے بعد یقین کے حالات معلوم کرنے کا فکر ہوا۔ کچھ تذکرے خریدے، کچھ مانگے کے لئے

کچھ کتب خانہ میں دیکھے، کچھ نقل کرا کے منگوائے۔ قصہ مختصر ان تذکروں کا ایک انبار ہو گیا۔ تاریخ ادب ہندوستان مولفہ گارسان دی تاسی فرانسیسی میں ہے۔ اس کے بعض حصّوں کا ترجمہ ہارون خاں صاحب شروانی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے اور بعض کا ترجمہ عبداللطیف صاحب خطیب پرنسپل جاگیردار کالج نے کر کے دیا۔ مصحفی کے تذکرے کی نقل عابد حسین صاحب وائس پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی نے بھیجی۔ اس طرح کتابوں کے بار کے ساتھ احسانات کا بار بھی بڑھتے بڑھتے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اب جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ پسند کیا گیا تو فبہا، نہیں تو میری محنت گئی اور ان لوگوں کا احسان رہ گیا۔

اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی فہرست ذیل میں دیتا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی مجھے سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی صرف اس امید پر کرنی پڑی ہے کہ شاید یقین یا ان کے خاندان کا کچھ حال مل جائے۔ بہر حال میں اتنی محنت اٹھانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا، مگر سنگ آمد و سخت آمد کی صورت تھی۔ یہ بھی جی نہ چاہا کہ اتنا کچھ کر کے چھوڑ دوں۔ ہاں تو فہرست ملاحظہ ہو:

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	تاریخ تالیف
۱	نکات الشعرا[۱]	میر تقی میر	سنہ ۱۱۶۴ھ
۲	تذکرہ شعرائے ہند	فتح علی حسینی[۲] گردیزی	سنہ ۱۱۶۵ھ
۳	تذکرۂ بزم گلشن گفتار	خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی	سنہ ۱۱۶۵ھ

[۱] مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن [۲] ان کا شمار دہلی کے مشہور صوفیوں میں ہوتا تھا۔

(بقیہ بر صفحہ آیندہ)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مؤلّف	تاریخ تالیف
۴ -	مخزنِ نکات	قیام الدین۔ قائمؔ	۱۱۶۸ھ
۵	چمنستانِ شعراء	لچھمی نراین شفیق	۱۱۷۵ھ
۶	طبقات الشعراء	قدرت اللہ شوقؔ[1]	۱۱۸۸ھ
۷	تذکرہ شعرائے اردو[2]	میر غلام حسن حسنؔ	مابین ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ
۸	گلزارِ ابراہیم	علی ابراہیم خاں	مابین ۱۱۹۶ھ و ۱۱۹۸ھ
۹	تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی۔ مصحفیؔ	۱۲۰۹ھ
۱۰	تاریخ ادب ہندوستان	گارسان دی تاسی	۱۲۱۱ھ
۱۱	گلشنِ ہند	مرزا علی لطف	۱۲۱۵ھ
۱۲	گلشنِ بیخار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ	۱۲۵۰ھ
۱۳	طبقات الشعرا	کریم الدین	۱۲۶۲ھ
۱۴	تذکرہ سراپا سخن	سید محسن علی محسنؔ	۱۲۶۹ھ

(بقیہ نوٹ) ۱۲۲۱ھ کے کچھ بعد دہلی میں فوت ہوئے۔ میر تقی میر نے انعام اللہ خاں یقینؔ کے خلاف بہت زہر اگلا ہے اس کو دیکھ کر گردیزی کو جوش آگیا اور تذکرہ شعرائے ہند لکھ کر دل کا بخار نکالا۔

: انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) نے یہ تذکرہ طبع کرایا ۱۲

[1] قدرت اللہ شوق۔ موضع موی ضلع سنبھل کے رہنے والے تھے۔ اپنے زمانہ کے عالموں میں ان کا شمار تھا عرصہ تک دہلی میں رہے۔ پھر رام پور میں جا بسے۔ قیام الدین قائمؔ کے شاگرد ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۲۰۷ھ و ۱۲۱۰ھ کے درمیان ہوا ہے۔ ان کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں اس کا ایک نہایت خوش خط نسخہ ہے ۱۲ [2] مطبوعہ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) دکن

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولّف	تاریخ تالیف
۱۵	سخن شعراء	عبد الغفور نسّاخ[۱]	سنہ ۱۲۸۱ھ
۱۶	گلستانِ بیخزاں	قطب الدین باطن[۲]	سنہ ۱۲۹۱ھ
۱۷	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	سنہ ۱۸۸۴ء
۱۸	بزمِ سخن	سید علی حسن خاں	سنہ ۱۲۹۷ھ
۱۹	آبِ بقا	مرزا جعفر علی نشتر	سنہ ۱۹۱۸ء
۲۰	گلِ رعنا	حکیم عبد الحی[۳]	سنہ ۱۳۴۰ھ
۲۱	اورینٹل بایوگریفیکل ڈکشنری	ولیم بیل	سنہ ۱۸۷۵ء
۲۲	خزینۃ الاصفیاء	غلام سرور[۴]	سنہ ۱۲۸۱ھ

[۱] مرزا ابو محمد عبد الغفور خالدی نسّاخ کلکتہ کے رہنے والے اور ضلع راجشاہی معروف بہ رامپور بوالیہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ شاعر اور صاحبِ ذوق تھے۔ اساتذہ کے کلام دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ۱۲ برس کی محنت میں یہ تذکرہ سخنِ شعراء تالیف کیا۔ میں نے دوسرے تذکروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ ان کی اپنی تحقیقات کچھ نہیں ہیں۔ صرف قدیم تذکروں سے واقعات نقل کئے ہیں۔ [۲] قطب الدین باطن۔ ان کے والد عرب سرائے کے رہنے والے تھے جو دہلی سے تین میل ہے۔ بعد میں آگرہ جا رہے۔ باطن وہیں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان حکیموں کا ہے۔ باطن کو نظیر اکبرآبادی سے تلمذ تھا۔ شیفتہ نے گلشنِ بیخار میں نظیر کی تعریف نہیں کی۔ اس لئے اس کے جواب میں انھوں نے یہ تذکرہ اردو میں لکھا ہے اور شیفتہ کے استاد حکیم مومن خاں مومن کے متعلق بہت واہی تباہی بکا ہے۔ تذکرہ کی عبارت ایسی ہے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ [۳] حکیم عبد الحی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم تھے۔ جنت المشرق یعنی جغرافیۂ ہند، کتاب المعارف، نزہت الخواطر وغیرہ ان کی مشہور تالیفات ہیں۔ سنہ ۱۳۴۱-۴۲ھ میں انتقال کیا ۱۲ [۴] غلام سرور لاہور کے رہنے والے اور لاہور کے مفتیوں کے

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	تاریخ تالیف
۲۳	مآثر الامراء	صمصام الدولہ شاہ نواز خاں[1]	۱۱۹۴ھ
۲۴	مجموعۃ الانتخاب	فقیر[2] شاہ کمال الدین حسین کمال	۱۲۱۹ھ
۲۵	فہرست کتب خانہ شاہ اودھ	ڈاکٹر اسپرنگر[3]	۱۸۴۸ء

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) خاندان سے تھے۔ خزینۃ الاصفیاء دو جلدوں میں لکھی ہے اور اس میں صوفیائے کرام کے تمام سلسلوں کے حالات نہایت شرح و بسط سے درج کئے ہیں۔ [1] شاہ نواز خاں نام صمصام الدولہ خطاب خاندان آصفی کے امراء میں تھے۔ ۱۱۶۷ھ میں نواب امیر الممالک خلف آصف جاہ نجاب تراہ کی خدمت وکالت سے سرفراز ہوئے۔ عالم بھی تھے اور علم دوست بھی۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ مآثر الامراء کی تالیف میں علامہ مذکور سے بھی مدد لی ہے۔ یہ تالیف بلحاظ تفصیل و تحقیق ایک لاجواب کتاب ہے۔ [2] شاہ کمال الدین۔ کمال اردو کے مشہور شاعر تھے۔ ان کے بزرگ کڑہ مانک پور کے رہنے والے تھے لیکن ان کے والد بہار میں جا بسے۔ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں ان کے بزرگ بڑی بڑی خدمات پر مقرر تھے۔ جوانی ہی میں کمال فقیر ہوگئے اور بنگالہ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ پہلے یہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے اور اپنی اصلاح کے لئے اساتذہ کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلیا۔ بعد میں جرأت سے اصلاح لینی شروع کی۔ آخر میں پھرتے پھراتے اپنے جمع کردہ دیوان کے ساتھ حیدرآباد دکن آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ دکن میں شمالی ہند کے شعراء کے دیوانوں کا جو ذخیرہ ہے وہ اکثر و بیشتر کمال ہی کے لائے ہوئے دیوانوں کی نقل ہے۔

ان کا مجموعۃ الانتخاب ایک ضخیم کتاب ہے۔ لیکن شعراء کے حالات صرف ایک ایک دو دو سطروں میں دیئے ہیں۔ ۱۸۴۳ء تک کمال زندہ تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ نواب کرنول نے اس کو جاگیر دی تھی۔ کرنول کی ریاست ضبط ہوئی۔ لیکن کمپنی نے کمال کی جاگیر پھر اس پر بحال کردی ۱۲

[3] ڈاکٹر اسپرنگر وہ مستشرق ہیں جن کی ذات پر یورپ کو بھی ناز ہے۔ انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے جو فہرست کتب خانہ شاہ اودھ کی مرتب کی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ حالات گو مختصر ہیں لیکن

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مؤلف	تاریخ تالیف
۲۶	فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم	چارلس ریو	۱۸۷۹ء
۲۷	فہرست کتب خانہ انڈیا آفس (فارسی)	ہرمن ایتھے	۱۹۰۳ء
۲۸	فہرست کتب ایشیاٹک سوسائٹی بنگال	آیونو	۱۹۲۴ء
۲۹	فہرست کتب انڈیا آفس (اردو)	بلوم ہارٹ	۱۹۲۶ء
۳۰	خمخانۂ جاوید جلد اول تا چہارم	لالہ سری رام[ل] دہلوی	۱۳۲۵ھ

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) تحقیقات کے لحاظ سے بہترین کتاب ہی۔ کیا اچھا ہو اگر انجمن ترقی اردو اس کتاب کے اس حصہ کو جو شعرائے اردو سے متعلق ہی ترجمہ کرکے شائع کرے! انعام اللہ خاں یقین کے کلام کے متعلق جہاں میں نے تذکرہ نویسوں کی رائے لکھی ہی وہاں ڈاکٹر اسپرنگر ہی کا طریقۂ بیان اختیار کیا ہے، یعنی پہلے تذکرہ نویس کی رائے اور اس کے بعد قوس میں اس کا نام۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہی کہ تذکرہ نویس کا نام دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہی کہ اس کی رائے پر اعتماد کیا جا سکتا ہی یا نہیں۔

ل لالہ سری رام ایم اے۔ دہلی کے رئیس اور اردو کے دلدادہ ہیں۔ آپ کے والد لالہ مدن موہن آنجہانی بہت مشہور وکیل گزرے ہیں۔ سری رام صاحب عرصہ تک خدمتِ منصفی پر رہے لیکن اس زمانہ میں بھی اردو کے ذوق و شوق کو ہاتھ سے نہ دیا اور مدتوں کی تلاش اور لاکھوں روپئے خرچ سے شعرائے اردو کے دیوانوں کا ایسا ذخیرہ جمع کر لیا کہ اس کا مقابلہ شاید ہی کہیں کا کوئی کتب خانہ کر سکے۔ جب ملازمت سے فارغ ہوئے تو تالیف کا رخ کیا اور خمخانۂ جاوید کو نہایت آب و تاب اور تحقیق و تلاش سے مرتب کرکے شائع کرایا۔ اس کی چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ دس بارہ اور باقی ہیں۔ افسوس کہ حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے یہ کیا کہ جو نسخہ مجھے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ سے ملا تھا اس کی نقل کی۔ یہ ہی نسخہ سب سے پرانا تھا اور ۱۱۹۷ھ[1] میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرے نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا۔ الفاظ کی بھی درستی کی اور جو نئی غزل ملی وہ بڑھالی۔ غرض تیرہ قلمی دیوانوں سے اس کی صحت کرکے تذکروں کے اشعار سے مقابلہ کیا اور اس طرح ایک ایسا نسخہ مرتب کرلیا۔ جو کیا بلحاظ صحت الفاظ (بشرطیکہ مطبع والے اس کو قائم رکھیں) اور کیا بلحاظ تعدادِ اشعار مکمل نہیں تو مکمل کے قریب قریب ضرور ہے۔ اس مقابلہ میں جو مشکلیں مجھ پر پڑی ہیں وہ میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر دیتا ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ قلمی کتابوں میں کیسی غلطیاں ہوتی ہیں اور کس طرح بے سوچے سمجھے نقل کی جاتی ہے۔ یہ شعر میں اس لئے بھی دے رہا ہوں کہ اب تک مجھے اس کے متعلق اطمینان نہیں ہوا:

اگر رستم ہو عاشق، دم نہ مارے یار کے آگے
کہ اس کا جی نکل جاوے گا اس کی ایک لنگن میں

دامن، گلشن قافیہ ہے اب ملاحظہ ہو کہ اس شعر کا قافیہ قلمی نسخوں میں اس طرح ہے
(۱) لنگن (۲) سنگن (۳) لٹکن (۴) تھنکن (۵) ٹھن کن
(۶) ٹھونکن (۷) پھیکن

مجھے تو لنگن کا قافیہ سب سے بہتر معلوم ہوا کیوں کہ پہلے زمانہ میں پہلوانوں کی

---

[1] عمر یافعی صاحب کا ایک نسخہ بعد میں ملا جو اس سے بھی پرانا اور ۱۱۸۰ھ کا لکھا ہوا تھا۔

اصطلاح میں لنگن مدِّمقابل کے جانگیہ میں ہاتھ ڈال کر پلٹ دینے کو کہتے تھے اب اس پیچ کو قلاجنگ کہتے ہیں۔ پھیکن بھی آسکتا ہے۔ کیوں کہ تلوار پھینکنے کو پھیکن کہتے ہیں بقیہ الفاظ کے اگر کچھ معنی ہوں تو ہوں۔ میں نے بہت سی لغت کی کتابیں دیکھ لیں مجھے تو کہیں نہیں ملے۔

بس ایک یہی شعر ہے جس کے ایک لفظ کے متعلق مجھے شبہ ہے باقی تمام دیوان میں کہیں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی قلمی نسخہ میں کوئی ایسے الفاظ ملے جو وہاں چسپاں بھی ہوتے تھے اور معنی کو بھی وسعت دیتے تھے ان کو "ن" دیکر حاشیہ میں لکھدیا ہے۔

اس کے بعد سب سے مشکل سوال الفاظ کی املا کا تھا۔ پرانے زمانہ کی جتنی کتابیں چھپتی ہیں ان میں تو کو توں، مجھکو کو مجکوں وغیرہ لکھا جاتا ہے۔ تاکہ جوں کی توں نقل ہوجائے اور دیکھنے والا دیکھتے ہی سمجھ لے کہ او ہو بڑے پرانے زمانہ کی کتاب ہے۔ میں نے اس پرانے طریقہ کو ترک کردیا ہے اور موجودہ زمانہ کی املا میں الفاظ کو لکھا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو، اور تحریر بے حیثیت نہ ہوجائے ہاں یہ ضرور ہے کہ قدیم زمانہ میں جو الفاظ رائج تھے ان کو بجنسہ قائم رکھا ہے۔ غرض سوائے تھوڑی سی املا کے ردوبدل کے میں نے خود اس دیوان میں اپنی طرف سے ایک لفظ کم یا زیادہ نہیں کیا ہے۔

نواب انعام اللہ خاں یقین

خاندانی حالات | انعام اللہ خاں نام، یقین تخلص دہلی میں پیدا ہوئے اور ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو اگر ایک طرف اپنے زہد و تقویٰ، بزرگی و نجابت میں مشہور و مفتخر تھا تو دوسری طرف دولت و ثروت، امارت و وقار میں نامور اور ممتاز تھا۔ اگر ان کے دادا حضرت شیخ عبدالاحد نقشبندی مجددیؒ اپنے کمالاتِ باطنی کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے، تو ان کے نانا نواب حمید الدین خاں اپنی شجاعت و بہادری کے باعث سلطنت کے رُکنِ رکین مانے جاتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب اگر ددھیال کی طرف سے چوتھی پشت میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی اور بتیسویں واسطہ سے خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا تھا تو ننھیال کی جانب سے چوتھی پشت میں باقی خاں قلماق چیلہ شاہجہانی سے جاملتا تھا۔

حضرت شیخ احمدؒ سے شاہانِ مغلیہ کو خاص ارادت تھی اور جہانگیر کے عہد سے لگا کر اورنگ زیب کے آخری زمانہ تک خود بادشاہ، شاہزادے، امراء و علمائے دربار سب کے سب اسی سلسلہ میں بیعت ہوتے تھے۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد آپ کے دو فرزند شیخ احمد سعیدؒ اور

شیخ محمد معصومؒ و سادۂ ہدایت و ارشاد پر بیٹھے۔ شیخ احمد سعیدؒ کے بعد ان کے فرزند شیخ عبدالاحدؒ المعروف بہ شاہ وحدت المتخلص بہ گل سجادہ نشین ہوئے۔ یہ انعام اللہ خاں یقین کے دادا ہیں۔ آپ کی شہرت کا یہ حال تھا کہ میر تقی میر جیسا بد دماغ شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چنانچہ اپنی کتاب نکات الشعرا میں بضمن حالات انعام اللہ خاں یقین لکھتے ہیں کہ:

"با جدش در سرہند ملاقات کردہ بودم۔ بسیار آدم بامزہ یافتہ بسلوک پیش آمدہ، ضیافت فقیر کردہ۔ تا دیر نشستہ صحبت متوفی داشتم شعر بطرز من گوید" ص ۸۱

شیخ عبدالاحدؒ کے فرزند شیخ اظہرالدین سرہند چھوڑ دہلی آئے۔ یہاں آپ کے خاندانی فضائل کا ہر شخص معتقد تھا۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواب حمیدالدین خاں نے اپنی صاحبزادی کی شادی آپ سے کردی اور اس طرح دونوں خاندانوں میں بیعت کے سلسلہ کے علاوہ دنیاوی سلسلہ بھی قائم ہوگیا۔

نواب حمیدالدین خاں کے والد کا نام سردار خاں اور دادا کا نام باقی خاں چیلہ شاہجہانی ہے۔ باقی خاں کا عروج شاہجہان کے زمانہ سے شروع ہوا۔ پہلے ہفت صدی پانصد سوار کا منصب ملا اور اس کے بعد بڑھتے بڑھتے امرار دو ہزاری و دو ہزار سوار میں شریک ہو گئے۔ بادشاہ نے علم، اسپ و فیل عنایت کرکے جہترہ کا فوجدار کیا۔ وہاں جھجار سنگھ کے ایک سردار چنپت بندیلہ نے شورش مچائی۔ باقی خاں نے

اس کو شکست دی اور اس صلے میں دارالخلافہ میں طلب ہو کر غسل خانے کے داروغہ مقرر ہوئے۔

ان کے فرزند سردار خاں (سردار بیگ) کا ستارۂ اقبال عالمگیر کے زمانے میں چمکا، اہتمام خاں خطاب ملا اور دہلی کی شاہی عمارتوں کے داروغہ ہو گئے۔ کچھ دن نہ گزرے تھے کہ اُردوے شاہی اور دربار کے کوتوال مقرر ہوئے۔ ان کی کاردانی اور دولت خواہی کا عالمگیر پر اتنا اثر تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد بعض کارخانجات حرم سرا کی نظارت، فیل خانے کا بندوبست اور شاہی لشکر کا انتظام ان کے سپرد ہو گیا۔ ان کو فقرا سے بڑی عقیدت تھی اور ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ۱۱۰۳ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

ان کے فرزند حمیدالدین خاں نے تو عالمگیر کے زمانے میں وہ زور پکڑا کہ بیان سے باہر ہے۔ تمام کارخانجات کا انتظام اور دولت خانۂ بادشاہی کا اہتمام ان ہی کے سپرد تھا۔ یہ قسمت بھی ایسی لے کر آئے تھے کہ جس مہم پر ہاتھ ڈالا اس کو سر کیا۔ جو کام سپرد ہوا اس کو پورا کیا۔ عالمگیر نے بھی ان کے اعزاز و اکرام اور ترقیِ مدارج میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ بڑھاتے بڑھاتے امرائے سہ ہزاری پانصدی اور دو ہزار سواروں کے طبقے میں شریک کر لیا۔ عادل شاہیوں کے مقابلے میں ان سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں ظہور پذیر ہوئے۔ ایک دفعہ عین لڑائی میں سے ان کا ہاتھی نکل بھاگا۔ یہ اس پر سے کود پھر شریکِ جنگ ہوئے اور

دشمنوں کو مار ہٹایا۔ ان ہی کارگزاریوں کے صلے میں جیغہ مرصع، جگلوس، تکیہ مرصع اور فیل انعام میں پایا اور غسل خانہ خاص اور جواہر خانے کے داروغہ ہو گئے ۱۱۱۸ھ میں عالمگیر کا انتقال ہوا۔ ایسے قدردان بادشاہ کا ان کو جتنا بھی صدمہ ہوتا وہ کم تھا۔ لاش کے ساتھ احمد نگر سے دولت آباد تک پاپیادہ آئے اور بادشاہ کی قبر کی جاروب کشی اختیار کی۔ محمد اعظم شاہ نے بڑی منتوں اور سماجتوں سے ان کو اپنے ساتھ لیا اور ان کا وہی پہلا رتبہ ان کو عطا کیا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں ان کو عصائے مرصع کے ساتھ خدمتِ میر تزکی اور داروغگی گرزبرداران ملی اور بہادر عالمگیری کے خطاب سے سرفراز ہوئے بہادر شاہ کے آخر زمانے تک یہ اسی اعزاز و اکرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ جب جہاندار شاہ کا عہدِ حکومت آیا تو ذوالفقار خاں وزیر کے بھڑکانے سے ان کو قید کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ذوالفقار خاں کا ستارۂ اقبال غروب ہوا اور انھوں نے قید سے رہائی پائی۔ لیکن فرخ سیر کے دربار میں ان کو کوئی جگہ نہ ملی اور سیف الدولہ عبدالصمد خاں ناظم پنجاب ان کو اپنے ساتھ لے گیا۔ محمد شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی ان کو بلا بھیجا اور ان کی سابقہ خدمات پر بحال کر دیا۔ ان کے اثرات اور ان کے اقتدار کا حال دیکھنا ہو تو مآثر الامرا ملاحظہ ہو لکھا ہے کہ:

"در آخر عہد خلد مکان مدارِ سلطنت گردیدہ۔ رتق و فتق دولت خانہ ر

بادشاہی وضبط وربط کارخانجات عمدہ بدو مفوض بود۔ باین ہمہ
تیرروی ترکش خلیفۂ زمان بودہ چہ درمورچال قلاع وچہ درحوالی اردو
ودردستیہا بمالش وتنبیہ اشقیا تعین می گشت وہرجا می رفت بہ تکتک
پا وضرب دست مخالف رازدہ وبرداشتہ سالم وغانم مراجعت می نمود
وبانواع تحسین اعزاز می اندوخت ازیں بود کہ بہ نیچۂ عالمگیری زبان زدِ
عوام شدہ ''

شیخ اظہرالدین کی شادی حمیدالدین خاں کی لڑکی سے کب ہوئی اس کا پتا
نہیں چلتا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا۔ بھلا ایسے
بڑے گھرانے میں ان کی شادی ہو اور یہ ارکین سلطنت میں داخل نہ ہو جائیں
شادی کے بعد ان کو خطاب ''ثانی'' ملا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد نواب
مبارک جنگ بہادر کے خطاب اور ہزار و پانصدی منصب کے ساتھ محمد شاہ بادشاہ
کے طبقۂ امراء میں داخل ہو گئے۔ اس کتخدائی کا نتیجہ انعام اللہ خاں یقین ہیں
انعام اللہ خاں یقین کی تاریخ پیدائش کا پتا چلانا دشوار ہے۔ البتہ ان کی تاریخ
انتقال سے ان کی تاریخ پیدائش پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے اور اس لئے ہم پہلے
ان کی تاریخ انتقال سے بحث کرینگے۔ کیوں کہ بعض تذکرہ نویسوں نے اس
تاریخ کو بھی کسی قدر مشتبہ کر دیا ہے۔ سب تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ یہ اپنے
والد کے ہاتھوں مارے گئے۔ عبدالغفور نساخ نے سخن شعراء میں، علی ابراہیم خاں نے

تذکرۂ گلزارِ ابراہیم میں، طامس ولیم بیل نے اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری میں، اور دی تاسی نے اپنے تذکرہ تاریخ ادب ہندوستان میں لکھا ہے کہ یقین احمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں مارے گئے۔ چنانچہ بیل نے اسی وجہ سے ان کا سنہ انتقال ۱۱۶۳ھ[1] (۱۷۵۰ء) لکھا ہے۔ لیکن میری رائے میں یقین کی یہ تاریخ انتقال صحیح نہیں ہے۔ احمد شاہ بادشاہ کا عہد حکومت ۱۱۶۳ھ سے ۱۱۶۷ھ تک تھا۔ میر تقی میر کا تذکرۂ نکات الشعراء ۱۱۶۴ھ میں فتح علی الحسینی گردیزی کا تذکرہ شعرائے ہند ۱۱۶۵ھ میں اور قیام الدین قائم کا تذکرہ مخزن نکات ۱۱۶۸ھ میں مرتب ہوا۔ ان سبھوں نے انعام اللہ خاں یقین کے نہ تو مرنے کے واقعہ کو لکھا ہے اور نہ کوئی ایسا لفظ اس میں آیا ہے جو ان کی وفات پر دلالت کر سکے۔ بلکہ ان تذکروں کے الفاظ سے پایا جاتا ہے کہ کسی زندہ شخص کا حال لکھا جا رہا ہے۔ مثلاً فتح علی الحسینی گردیزی نے ۱۱۶۵ھ میں لکھا ہے:

"با مولف اخلاص دارد و اکثر با بملاقات می پردازد"

سب سے پہلی کتاب جس میں یقین کے انتقال کا ذکر ہے لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ "چمنستانِ شعرا" ہے۔ یہ ۱۱۷۵ھ میں مرتب ہوا اور اس میں شفیق نے یقین کے انتقال کی تاریخ بھی درج کی ہے۔

---

[1] تذکرہ آب بقا میں یقین کے قتل کا سنہ ۱۱۴۲ھ دیا ہے میں اس تحقیق کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ۱۲

شاعرِ نازک سخن و خوش خیال | کرد سفر جانبِ ملک عدم
سالِ وصالش خردِ نکتہ سنج | گفت یقیں رفت بسوئے ارم

اس سے ۱۱۶۹ھ نکلتے ہیں اور میرے خیال میں اس سے زیادہ مستند کوئی شہادت نہیں ہو سکتی شفیق کو یقین کے کلام سے عشق تھا۔ یہاں تک کہ وہ یقین کے وجہ سے میر تقی میر سے بگڑ بیٹھے اور جو کچھ منھ میں آیا میر صاحب کو سُنا گئے۔ اب حجت کی جا سکتی ہی کہ دلی کے حالات اورنگ آباد میں شفیق کو کیوں کر معلوم ہو سکتے تھے۔ یہ اعتراض چمنستانِ شعراء کے دیکھنے سے رفع ہو جاتا ہی ۱۱۶۹ھ ہجری میں حکیم بیگ خاں[1] حاکم دہلی سے اورنگ آباد آکر شفیق کے ہاں ٹھیرے اور یقین کے

---

[1] حکیم بیگ خاں حاکم فارسی کے بڑے زبردست شاعر اور نورالعین واقف لاہوری کے بڑے دوست تھے۔ ساتھ ہی سیّاحی کا بھی شوق تھا۔ دونوں دوست مکہ معظمہ کے ارادے سے نکلے۔ پہلے دہلی میں قیام کیا وہاں سے غلام علی آزاد سے ملاقات کرنے کے لئے اورنگ آباد آکر ٹھیرے اور یہیں شفیق سے ان کی ملاقات ہوئی حاکم نے ہندوستان میں سیاحت کر کے ایک تذکرہ تیار کیا تھا۔ اس کا نام "مردم دیدہ" تھا۔ اب نا پید ہی شفیق نے حاکم سے یقین کا حال پوچھا۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ بجنسہٖ نقل کرتا ہوں: "انعام اللہ خاں یقین در سنہ تسع و ستین و مائۃ و الف (۱۱۶۹ھ) ملاقات نمودم۔ مرد خوبے، متواضع بنظر رسید۔ اشعار خود بسیار خواند و استعمال تریاک باوجود صغر سنی کہ (۳۰) سی نخواہد بود بحدے داشت کہ تمام رنگ روئیش رنگِ کہربا گرفت۔ بعد انتقالش اکثر اشخاص در ہماں سنہ شہرت دادند و گفتند کہ ایں یوسفِ مصرِ سخندانی جوریا فتۂ اخوان ست بل مقتولِ یعقوب ست۔" اس بیان میں حافظہ کی غلطی کو دخل نہیں کیوں کہ "مردم دیدہ" کی تحریری نوٹ بک ان کے پاس موجود تھی۔ اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہی کہ یقین کے باپ نے اس کو قتل کیا تھا لیکن جس زمانے میں یہ قتل ہوا اس زمانے میں بھی وجہ نہ معلوم ہو سکی۔ بلکہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ باپ کا ظلم اس کے قتل کا باعث ہوا۔

اسی سال مرنے کا حال بیان کیا۔ اسی بیان پر شفیق نے تاریخِ انتقال لکھی۔ اس عینی شہادت سے زیادہ اور کیا مضبوط شہادت ہو سکتی ہے۔

احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں یقین کے مرنے کا ذکر سب سے پہلے گلزارِ ابراہیم میں کیا گیا ہے۔ اسی تذکرے سے دی تاسی نے یہ واقعہ لیا اور پھر یہ غلطی پھیلتی ہی چلی گئی۔ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم ۱۱۹۸ھ کے قریب یعنی یقین کے مرنے کے ۲۹ سال بعد مرتب ہوا۔ اس کے مؤلف نہ دہلی کے رہنے والے تھے اور نہ کبھی دہلی آئے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا لوگوں سے سن سنا کر لکھا۔ اس پر غضب یہ ہے کہ اُنھوں نے کسی بیان کرنے والے کا نام بھی نہیں دیا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس شخص کو بھی یقین سے ملنے یا اس کے حالات معلوم کرنے کا موقع تھا یا نہیں۔ بہر حال اس تذکرہ نے جو یقین کا سنہ انتقال درج کیا ہے، وہ قابلِ یقین نہیں ہو سکتا اور اسی طرح جن تذکروں نے اس سے یہ مضمون لیا ہے ان کی صحت کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

"عمرش زیادہ بر بست و پنج نہ خواہد بود کہ پدرش او را کشتہ۔"

گلزارِ ابراہیم میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا۔ البتہ دی تاسی نے یقین کی عمر ۲۵ سال کی لکھی ہے اور اس کے بعد گلستانِ بے خزاں، گلِ رعنا، سخن شعرا، طبقات الشعراء مؤلفہ کریم الدین اور ولیم بیل نے ان ہی تذکروں سے یقین کی عمر ۲۵ سال کی قرار دی ہے۔ البتہ قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں

زرا احتیاط برت کر "درعین عنفوانِ جوانی پدرش گشت" کے الفاظ سے یقین کی عمر ظاہر کی ہے۔

لیکن بعض واقعات ایسے ہیں جن کی بنا پر یقین کی عمر کا تعین صحیح طور پر نہیں ہوا ہے، چمنستانِ شعرا میں حکیم بیگ خاں حاکم کی زبانی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یقین کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ اوّل تو یہ ایسے شخص کا بیان ہے جو اس زمانہ میں یقین سے ملا تھا دوسرے بعض ایسے حالات ہیں جن کے لحاظ سے بھی بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میرے ایک کرم فرما مولوی سید محی الدین صاحب قادری پی۔ ایچ۔ ڈی لنڈن کے کتب خانہ میں شاہ حاتم[1] کا اصلی دیوان دیکھ کر آئے ہیں۔ اس میں

---

[1] حاتم۔ ظہور الدین المعروف بہ شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں نواب عمدۃ الملک کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ آخر میں دنیا سے کنارہ کش ہوکر دہلی دروازہ کے باہر ایک تکیہ میں جا پڑے۔ دہلی میں شاعری کی ابتدا اُن ہی سے ہوئی۔ مرزا رفیع سودا کے علاوہ ۴۴ اور شاگرد تھے جن میں سے اکثر اُردو کے نامور شعرا ہوئے یہ خود صاحبِ دیوان تھے۔ اپنے ضخیم دیوان کا خلاصہ کرکے اس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ ۱۲۰۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔
جو دیوان قادری صاحب نے دیکھا ہے وہ پہلے لکھنؤ میں تھا۔ اس کا ذکر ڈاکٹر اسپرنگر نے کیا ہے کہ یہ دیوان خود شاہ حاتم نے ۱۱۶۹ھ میں اپنے قلم سے لکھا تھا۔ موتی محل لکھنؤ کے کتب خانہ میں تھا۔ ہر غزل کے اوپر اس کے لکھنے کی تاریخ درج تھی۔ ہر غزل کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ کس کی طرز پر لکھی گئی چنانچہ خود شاہ حاتم دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "سرخیِ غزلیات بہ سہ قسم بعیدِ قلم آورد۔ یکے طرحی دوم فرمایشی۔ سوم جوابی۔ تا تفریق آں معلوم گردد۔" (رامپور کے کتب خانے میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے)

اس شاعر نے یہ التزام رکھا ہے کہ ہر غزل کے اوپر اس کے لکھنے کے سنہ کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ غزل کس شاعر کی طرز پر لکھی گئی۔ اس دیوان میں آٹھ غزلیں ایسی ہیں جو حاتم نے یقین کی طرز پر لکھی ہیں۔ ان غزلوں سے میں آیندہ بحث کروں گا۔ یہاں صرف یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یقین کی طرز پر جو سب سے پہلی غزل حاتم نے لکھی اس کے لکھنے کا سنہ ۱۱۵۲ ہجری ہے۔ اگر یقین کی تاریخ انتقال سنہ ۱۱۶۹ھ سے اس کی عمر ۲۵ سال قرار دے کر اس کی پیدایش کا سنہ نکالا جائے تو وہ سنہ ۱۱۴۴ھ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ۸ برس کے لڑکے نے یہ غزل لکھی اور ایسی لکھی کہ حاتم جیسا جگت استاد اس کا تتبع کر رہا ہے۔ اس لحاظ سے حکیم بیگ خاں حاکم کے بیان کو باور کر کے اگر یقین کا سنہ پیدایش ۱۱۴۰ ہجری قرار دیا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

یقین کے حالات | یقین کے حالات کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ فتح علی حسین گردیزی کا یقین سے بہت دوستانہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ سوائے اس کی تعریفیں کرنے کے ایک لفظ بھی یقین کے حالات کے متعلق اس نے اپنے تذکرے میں درج نہیں کیا۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں لکھتے ہیں۔ "جوانے بود خوش رو خوش گو خوش خلق و قابل منظور نظر۔"

مصحفی نے لکھا ہے کہ "جوانے بود مرزا مزاج و شیریں زبان از حسن وجاہت بہرۂ وافی داشت۔"

قیام الدین قائم کا قول ہے کہ :

"یقین ... ... یگانۂ عصر و وحید دہر ست باخلاقِ حمیدہ اتصاف دارد"

کریم الدین نے اپنے تذکرۂ طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ :

"وہ ایک جوان نیک رو، خوش خو ۲۵ برس کا تھا جب اس کے باپ نے اس کو قتل کر ڈالا تھا۔"

اب اس کے خلاف میر تقی میر کے فقرے سنئے جو انھوں نے نکات الشعراء میں یقین کے متعلق لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ :

"القصہ بر و پوچے چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم بافت این قدر بر خود چیدہ است کہ رعونتِ فرعون پیش اوپشتِ دست بر زمین می گزارد ... ... در بزرگ زادگی و شرافتِ میاں یقین سخنے نیست از خانوادۂ بزرگیست۔ با بندہ ہم آشنائی سرسری دارد۔"

خیر میر صاحب کو تو جانے دو ان کو تو یقین سے کدتھی جیسا کہ میں آئندہ ظاہر کروں گا، البتہ دوسرے معاصرین اور ان لوگوں کے بیانات سے جو یقین کے کچھ ہی بعد گزرے ہیں۔ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک شکیل، وجیہ، مرزا منش اور خوش خلق، خلیق اور شیریں زبان شخص تھے۔ شادی ہوگئی تھی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں ہوئی تھی۔ تین لڑکوں کا پتا تذکروں سے چلتا ہے:

(۱) مرید حسین خان مرید (۲) صمصام اللہ خاں احمد (۳) مقبول نبی خان مقبول

مرید حسین خاں مرید سب سے بڑے لڑکے تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۲۱ھ سے کچھ پہلے ہوا۔ منجھلے لڑکے صمصام اللہ خاں احمد تھے (ان کا نام بعض تذکرہ نویسوں نے صمصام الدین خاں بھی لکھا ہے) سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ صوبہ جاتِ شرقی[1] میں چلے گئے تھے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ چھوٹے لڑکے مقبول نبی خاں مقبول تھے۔ ان کا خطاب نواب مظہر الدین خاں تھا۔ یہ ۱۱۹۲ھ میں فرخ آباد چلے گئے۔ انھوں نے تین سو شعرا کے کلام سے تقریباً ۶۰ ہزار اشعار کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے وہ نذرِ آتش ہوگیا۔ یہ خوب چند ذکا کے دوست اور میاں نثار اللہ فراق کے شاگرد تھے۔

یقین کو افیون کھانے کا چسکا پڑ گیا تھا چنانچہ حکیم بیگ خاں حاکم نے لکھا ہے کہ:

"استعمالِ تریاک با وجود صغر سنی کہ (۳۰) سی نخواہد بود بحدے داشت کہ تمام رنگ روشنش رنگِ کہربا گرفت"

یہ خود بھی اپنے اشعار میں افیوں کی تعریف کر گئے ہیں: ؎

جس سے میرے سانورے کی لگ رہی ہے جستجو — جس طرح ہوتا ہے افیونی کو افیوں کا تلاش

ہمیں مارِ سیاہِ زلف کے کاٹے سے کیا ہووے — کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں خالِ لب کی افیوں کے

[1] ڈاکٹر اسپرنگر نے صوبہ جات شرقی کو اودھ قرار دیا ہے۔ مگر اس زمانہ کی تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ جات شرقی جون پور اور بہار کو کہتے تھے ۱۲

ان کے دیوان بھر میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس سے ان کے حالاتِ زندگی کچھ بھی معلوم ہو سکیں۔ البتہ دو اشعار ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر کچھ تھوڑی بہت عقل آرائی کی جا سکتی ہے۔ ایک شعر تو یہ ہے: ؎

خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقیںؔ   ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

خواجہ میر دردؒ کا سلسلۂ خاندانی خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ سے ملتا ہے اور یقیںؔ کا بھی سلسلہ ان سے جا کر ملا تھا۔ ممکن ہے کہ اس سبب سے انھوں نے اپنے آپ کو خاندانِ درد میں ہونا بیان کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ خواجہ میر دردؒ کے والد خواجہ محمد ناصر، یقیںؔ کے دادا شیخ عبدالاحدؒ کے خلیفہ شاہ گلشن[۱] سے بیعت تھے اور خواجہ میر درد، خواجہ میر اثر اور سارے کا سارا خاندان خواجہ محمد ناصر کا مرید تھا۔ اس طرح شاید شاعر کا یہ مطلب ہو کہ میرے ہی خاندان کی وجہ سے خاندان درد روشن ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ یقیںؔ کی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی ہو اور انھوں نے یہ فقرہ فخریہ کہا ہو کہ میرے اس خاندان میں آنے سے اس کو چار چاند لگ گئے۔

دوسرے شعر میں اپنے کسی عزیز دوست کے مرنے کا افسوس ظاہر کیا ہے۔ الفاظ بتا رہے ہیں کہ دونوں میں دوستی اور بہت پرانی دوستی تھی ؎

بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینے کا داغ   ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینے کا داغ

---

[۱] شیخ سعد اللہ گلشن نقشبندی فارسی کے بڑے پرگو شاعر تھے۔ مرزا بیدل کے شاگرد تھے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں انتقال کیا۔

ان دو شعروں کے علاوہ سارے دیوان میں (سوائے مرزا مظہر کے شاگردی کے اعتراف کے) ایک لفظ بھی نہیں ہے جس سے ان کے حالات کا اظہار ہو سکے۔

یقین کی موت | اس قدر زمانہ کے بعد یقین کے قتل کی وجہ کا معلوم کرنا اب یقیناً ناممکن ہے۔ واقعۂ قتل کے زمانۂ قریب میں بھی اس بارے میں لوگوں میں اختلاف تھا اور چوں کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ بلحاظ حالات اس پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی ہوگی۔ اس لئے افواہوں کی تعداد کا بڑھ جانا ایک لازمی امر تھا۔

بہر حال اس قتل کے متعلق دو وجوہ بتائے جاتے ہیں :

ایک یہ کہ یقین کو اپنے والد کی کسی برائی کی اطلاع ہوگئی تھی اور انھوں نے اس طرح اپنے راز کو افشا ہونے سے بچایا۔ دوسرے یہ کہ خود یقین سے کوئی برائی ہوئی تھی اس لئے اپنے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لئے ان کے والد نے ان کو قتل کیا۔

جس قدر تذکرے میرے پیش نظر ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت کا اظہار سب سے پہلے حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"می گویند پدرش بے گناہ اورا کشت و پارچہ پارچہ کردہ در دریا انداخت سببش چنیں معلوم شد کہ پدرش تعلقِ خاطر با دخترِ خود داشت نعوذ باللہ و او ازیں چیز ہا ممانعت می کرد۔ برائے اخفائے ایں حرکت اورا شہید کرد و اکثر چنیں

شہادت می دہند۔ خدا بہتر می داند"

حسن نے جو افواہ تھی وہ صاف صاف لکھ دی مگر تذکرۂ گلزار ابراہیم میں اس واقعہ کو ذرا کنایہ میں ادا کیا گیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ واقعہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اس تذکرے میں لکھا ہے کہ :-

"گویند بعہد احمد شاہ بہادر بنا بر ناملائمے کہ از یقین صادر می شد اورا پدرش کشت و بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوعِ جمیع ادیان بود۔ او منع می کرد۔ پدرش برآشفت و خونش بریخت"

اس کا ترجمہ مرزا علی لطف نے گلشنِ ہند میں کیا۔ لیکن عبارت کو مقفیٰ بنانے کے لئے بعض الفاظ اپنی طرف سے داخل کر دیئے۔ اس طرح معنی بدلنے سے مفہوم میں اس قدر وسعت ہو گئی کہ اب ہر برائی یقین اور اس کے والد کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے۔ اصل عبارت اوپر نقل ہو چکی ہے اب اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو :-

"مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہدِ سلطنت میں بہ سبب کسی حرکتِ نامعقول کے کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا اور نعش کو اس کی دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عملِ شنیع کا گزرا تھا اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو اشم

متنبہ کیا۔ ایک دن اس نے خفا ہو کر اس بچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا

برسستی خدا کو ہے اور یقین گماؤں کا بالکنہ اس خالقِ ارض و سما کو ہے"

یہ حکایت کیا تھی اور کیا سے کیا ہو گئی۔ دی تاسی نے اس واقعہ کو گلزارِ ابراہیم

سے لے کر اس کے معنی عجیب و غریب کئے ہیں۔ لکھا ہے کہ :

" بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا باپ اس کے ساتھ فعل شنیع کرنا چاہتا تھا۔

مظہر نے اس کی اجازت دیدی تھی مگر یقین نے انکار کیا۔ باپ اس مخالفت سے

ناراض ہوا اور اس کو قتل کر دیا۔ یہ خوف ناک حکایت علی ابراہیم نے بیان کی ہے"

علی ابراہیم کے الفاظ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ معلوم نہیں کہ دی تاسی نے

ان کے یہ معنی کہاں سے نکالے۔

صورت دوم کے متعلق طبقات الشعراء مولفہ قدرت اللہ شوق میں لکھا ہے:

" درعین عنفوانِ جوانی بدرش بہ سبب تقصیرے کہ از یقین بوقوع آمدہ باشد کشت"

گلزار ابراہیم میں صرف " بنا بر امر نا ملائمے کہ از یقین صادر می شد او را پدرش

کشت و بدریا انداخت "، لکھ کر واقعہ کو گومگو کر دیا ہے۔ دی تاسی بھی اس واقعہ کو

کسی قدر تبدیل کر کے لکھتا ہے :

" یقین کا اپنے باپ سے جھگڑا ہوا اور باپ نے بیٹے کو قتل کر کے اس کی

لاش دریا میں بہا دی"

طبقات الشعراءِ ہند میں اس الزام سے یقین کو بچا کر لکھا ہے کہ :-

" بہ سبب کسی حرکتِ نامعقول کے کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے باپ نے اس کے اس کو قتل کیا "

سخنِ شعرا میں عبد الغفور نسّاخ لکھتے ہیں کہ :

" یقین احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ۲۵ برس کی عمر میں تہمتِ زنا پر اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے بے گناہ شہید ہوئے "

بزمِ سخن میں بھی اسی واقعہ کو سببِ قتل ظاہر کیا گیا ہے کہ :

" بہ تہمتِ زنا از دستِ والدِ خویش بہ قتل رسید و ذائقۂ شربتِ شہادت چشید "

بلوم ہارٹ نے بھی اسی وجہ کو اس قتل کا باعث قرار دیا ہے۔

ایک تیسرا گروہ مورخین کا ایسا ہے جس نے سب سے زیادہ صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ اس گروہ کے سرِ دفتر مصحفی ہیں وہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :

" پدرش او را کشتہ در دیگ مدفون ساخت۔ ایں سر را کسے کہ میداند میداند "

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی گلشنِ بے خار میں یہی پہلو اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

" پدرش او را کُشت و وجہ قتل ظاہر نہ شد "

کریم الدین نے باوجود اس کے کہ ان کا تذکرہ (طبقات الشعرا) زیادہ تر دی تاسی کے تذکرہ پر مبنی ہے کسی خاص واقعہ کے اظہار سے اجتناب کر کے لکھا ہے کہ :

"اس کے باپ نے اس کو قتل کر ڈالا تھا یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے مذکور کو کیوں قتل کیا۔ کیوں کہ محبتِ پدری زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت اور قرابتیے لیکن اس جائے خدا جانے کیا ایسی حرکتِ ناشائستہ اس سے ہوئی ہے کہ اس کے باپ نے اس کو قتل کیا۔"

گلستانِ بے خزاں میں بھی اس واقعہ کو اسی پہلو سے لیا گیا ہے لکھا ہے کہ :

"اپنے والد کے ہاتھ قتل ہوئے۔ یکسر واللہ عالم کیا سبب تھا جس سبب سے یہ غضب تھا۔"

آبِ بقا میں بھی وجہ کا اظہار نہیں کیا گیا اور صرف یہ لکھ دیا گیا کہ :

"ان کے والد نے کسی وجہ سے خفا ہو کر ان کو قتل کیا"

مجھے توقع تھی کہ گلِ رعنا میں مولوی عبدالحی صاحب نے اس واقعہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہوگی لیکن یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ انھوں نے واقعہ کو نہایت مبہم طریقے پر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"پچیس برس کے سن میں یقین کا کام تمام ہو گیا۔"

ان تمام صورتوں کے علاوہ دی تاسی نے ایک اور شکل بیان کی تھی کہ :

"محسن کا بیان ہے کہ کسی شرط کے متعلق یقین اور ایک دوسرے نوجوان شخص میں تلوار چل گئی اور یقین مارا گیا۔"

میں نے محسن کا تذکرہ سراپا سخن دیکھا۔ اس میں اس واقعہ کا کہیں اندراج

نہیں ہے۔ یقین کے متعلق اس تذکرے کی پوری عبارت نقل کئے دیتا ہوں :

"انعام اللہ خاں یقین ولد اظہر الدین خاں جوان یوسف جمال پری تمثال نے عین شباب میں طعمۂ شمشیر ہو کے اس جہان سے رحلت کی۔ باشندۂ شاہجہان آباد شاگرد مرزا مظہر جان جاناں۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دی تاسی نے یہ غلط حوالہ دے کر کیوں ایک نئی حکایت گھڑلی ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر اور ولیم بیل نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ حاوی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس کے باپ نے اس کو قتل کر دیا کیوں کہ اس کی وجہ سے خاندان کی بدنامی ہوتی تھی۔"

یہ ایسے جامع الفاظ ہیں کہ جس قدر وجوہ اس قتل کے بیان کئے جائیں وہ سب اس میں آجاتے ہیں۔

یہ تمام حوالے دینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر سے بھی بحث کر دی جائے کہ ان حکایتوں پر کہاں تک اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان حکایتوں کے بیان کرنے والے سب کے سب ایسے ہیں کہ نہ تو اس واقعہ کے وقت دہلی میں موجود تھے اور نہ واقعہ کے بعد کبھی دہلی آئے۔ میر حسن نے ۱۲ برس کی عمر میں (۱۱۶۲ھ میں) دہلی چھوڑی اور پھر کبھی یہاں

نہیں آئے۔ گلزارِ ابراہیم کے مؤلف نے کبھی دہلی کی صورت بھی نہیں دیکھی لطف کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے گلزارِ ابراہیم سے صرف اس واقعہ کو ترجمہ کرکے لکھا ہے اپنی واقفیت کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ یقین کا زنا کی تہمت میں قتل ہونا سب سے پہلے نساخ[1] نے ظاہر کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۱ھ میں اس واقعہ کے ۱۱۲ سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس زمانے کے کسی مورخ کا حوالہ بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس کو باور کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھیڑیا چال کی صورت پڑگئی۔ کسی نے ایک تذکرے سے اس واقعہ کو لکھا کسی نے دوسرے سے۔ کسی نے یقین پر الزام قائم کیا اور کسی نے اس کے باپ پر۔ لیکن جو تذکرہ نویس دہلی کے ہیں اور جن کو وہاں کے حالات معلوم کرنے کا زیادہ موقع تھا اُنھوں نے صاف بیان کیا ہے کہ اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ یہ قتل آخر کس وجہ سے واقع ہوا۔ مصحفی ۱۱۹۰ھ ہجری میں دہلی میں آئے۔ وہ بھی اس معمے کو حل نہ کرسکے اور ان کو لکھنا پڑا کہ " ایں را ہر کہ می داند می داند"
اس کے دو معنی ہیں اول یہ کہ وہ ان عام افواہوں کی تردید کرتے ہیں جو ممکن ہے کہ شہر میں اس قتل کے متعلق پھیلی ہوئی ہوں اور دوسرے یہ کہ یقین کے قتل کی وجہ ایک راز ہے جو شاید صرف چند ہی لوگوں کو معلوم ہے۔

---

[1] مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ ناسخ نے یہ واقعہ کہاں سے لیا ہے ورنہ اس کے متعلق بھی رائے کا اظہار کرتا کہ اس مؤلف پر اعتماد ہوسکتا ہے یا نہیں ۱۲

میں تسلیم کرتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا زمانہ کچھ عرصہ بعد کا ہے لیکن اس معمے کو حل کرنے کے لئے جتنی سہولتیں ان کو تھیں اور کسی کو نہیں ہوسکتی تھیں۔ وہ دہلی کے امرا میں سے تھے۔ ان کا ایسے لوگوں سے میل جول تھا جو یقین کے خاندان کے ہمسایہ تھے۔ ممکن ہے کہ خود یقین کے لڑکوں سے وہ ملے ہوں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان کو آخر میں لکھنا پڑا کہ: "پدرش او را کشت و وجہ قتل ظاہر نشد"

جب دہلی میں رہنے والوں کو یہ حال معلوم نہ ہوسکا تو پھر باہر والوں کو یہ کیسے معلوم ہوسکا تھا جو کچھ انھوں نے لکھا محض افواہ پر لکھا اور افواہ پر کسی واقعہ کا قیاس خلافِ احتیاط ہے جو لوگ دہلی والے ہیں یا دہلی میں کبھی رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی بے سروپا افواہیں پھیلانے میں یہاں والوں کو کیا کمال حاصل ہے۔ یہاں کے لوگوں کی طبیعتیں جدت پسند واقع ہوئی ہیں۔ اگر کسی خبر میں جدت کا پہلو ہے اور ساتھ ہی کسی کی برائی بھی نکلتی ہے تو ایسی خبر سیلاب کی طرح بڑھتی ہے اور آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ نئے نئے حاشیے چڑھائے جاتے ہیں، طرح بہ طرح کی رنگ آمیزی کی جاتی ہے اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ خبر کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ دہلی کی تاریخ اٹھا کر دیکھو، اکثر خون خرابے انھیں افواہوں سے ہوئے ہیں۔ نادر شاہ دہلی میں بیٹھا تھا، جانوں پر بنی ہوئی تھی، لیکن پھر بھی یہاں والے اپنی طبیعتوں کو نہ روک سکے اور آخر قتلِ عام کرا ہی دیا۔ یہاں کے کسی واقعہ کی دریافت میں "می گویند" یا "کہتے ہیں" یا "سنتے ہیں" پر اعتماد کرنا نہایت

خطرناک ہے۔ چنانچہ خود اسی واقعہ کو دیکھ لو ہر تذکرے میں قتل کے دو تین مختلف وجوہ بتائے گئے ہیں لیکن جو لوگ یہاں والوں کی حالت سے واقف تھے، یہاں رہتے تھے اور جن کو واقعی اصل حال معلوم ہو سکتا تھا' ان کو دریافت کے بعد بھی لکھنا پڑا کہ: "یہ قتل ایک رازِ سربستہ ہے' بس جو جانتے ہیں وہی جانتے ہیں" اب رہے تذکرے تو ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ایک نے کچھ لکھا۔ دوسرے نے اس سے روایت لی۔ مگر اپنی طرف سے تھوڑا بہت کچھ اور بڑھا دیا۔ تیسرے نے اس کا ترجمہ کر کے رنگ ہی بدل دیا۔ اس لئے میں یقین کے قتل کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے والد نے ان کو کسی ایسی وجہ سے قتل کیا جس کا پتا چلنا اب ناممکن ہے کیوں کہ یہ راز صرف چند لوگوں کو معلوم تھا اور وہ ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔

کچھ تو بات ہے کہ شاعر "تلمیذ الرحمٰن" کہا جاتا ہے۔ آمدِ سخن کے وقت اس کو الہام سا ہوتا ہے۔ یقین ہی کو دیکھ لو اپنے عالمِ جوانی میں قتل ہونے کو اپنے کلام میں کئی جگہ باندھ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

زمانہ میں جو عاشق ہیں تمنا میں ہیں جینے کی ہمارا جی نکلتا ہے یقین مرنے کی حسرت پر

کمزور ہو چکے تھے' جانتے تھے کوئی دن میں مر جائیں گے بھلا" مرتے کو ماریں شاہ مدار" بننے سے کیا فائدہ ایسوں کو جینے دو شاید کسی کام آ جائیں ؎

یہ بیمار آپ مر جاتا جو جیتا ان کے کام آتا یقین کو مار کر زور آوراں کے ہاتھ کیا آیا

دو شعر تو ایسے ہیں کہ اگر ایک طرف ان کے عشق کا کچھ حال کھولتے ہیں تو دوسری طرف ان کی پاکبازی کی قسم کھاتے ہیں۔

دوسرے شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ کہنے والا اپنا سچّا سچّا حال بیان کر رہا ہے اس میں ریا کاری نام کو نہیں ہے ؎

یقین مارا گیا جرمِ محبت پر نہ ہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں

گرچہ ہوں غرق بحورِ عشق میں خوباں کے یقیں
لیک دامن ہے مرا گل کی طرح پاک ہنوز

تلمذ: انعام اللہ خاں یقین حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے سوائے کمال کے بقیہ سب تذکرہ نویسوں نے ان کو ان ہی کا شاگرد لکھا ہے۔ اور خود انھوں نے بھی حمد، نعت اور منقبت کے بعد اپنے استاد کی تعریف کی ہے ؎

جوں نماز اپنے یہ صبح و شام لازم کر یقیں
حضرتِ استاد یعنی شاہِ مظہر کی ثنا

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

مجھ سے پتھر کو کیا ہے جوں نگیں حرف آشنا
کون پہچانے یقیں بن حضرتِ مظہر کی قدر

سب تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ انھوں نے سوائے مرزا صاحب کے اور کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا معلوم نہیں کہ پھر کمال نے ان کو سودا کا شاگرد کس طرح لکھدیا۔

بعض تذکرہ نویسوں کی عنایت سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یقین نہ شعر

کہہ سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے ان کا سارے کا سارا دیوان مرزا مظہر جانِ جاناں کا کہا ہوا ہے۔ میں اس بارے میں زرا وضاحت سے بحث کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس قدر تذکرے میری نظر سے گزرے ہیں ان کے لحاظ سے مؤلفین کو چار قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ایک وہ جنھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔

دوسرے وہ جنھوں نے "میگوینڈ" کے عنوان سے صرف اس واقعہ کا ذکر کر دیا ہے

تیسرے وہ جنھوں نے اس واقعہ کی تائید کی ہے۔ اور

چوتھے وہ جنھوں نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔

مؤلفین کا سب سے بڑا گروہ طبقۂ اول میں آتا ہے۔ ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو اس زمانہ میں دہلی میں تھے یا وہ ہیں جن کو اس واقعہ کی تصدیق کے بہت مواقع تھے۔ ان سب کا اس واقعہ کے متعلق کچھ نہ لکھنا ایک حد تک اس بات کی دلیل ہو سکتا ہے کہ یا تو کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ ایسی افواہ تھی جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس گروہ میں فتح علی گردیزی (تذکرہ شعراء ہند) قیام الدین قائم (مخزنِ نکات) کریم الدین (طبقات الشعرا) عبد الغفور نساخ (سخن شعراء) قطب الدین باطن (گلستانِ بے خزاں) سید علی حسن خاں (بزمِ سخن) مرزا جعفر علی (آبِ بقا) بلوم ہارٹ (فہرست کتب قلمی انڈیا آفس) محسن (سراپا سخن) اور شیفتہ (گلشنِ بے خار) شریک ہیں۔ کریم الدین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ میں نے اس شخص (یقین) کی تعریف بہت

لوگوں کی زبانی سُنی ہی"

طبقۂ دوم میں مصحفی (تذکرہ ہندی)، علی ابراہیم خاں (گلزار ابراہیم) مرزا علی لطف (گلشنِ ہند) ولیم بیل (اورینٹل بایوگرفیکل ڈکشنری) خواجہ حمیدالدین اورنگ آبادی (تذکرہ بزم گلشنِ گفتار) شامل ہیں مصحفی نے لکھا ہی کہ:

"گویند مرزا جانِ جاناں بسیار دوست داشتے واکثر بہ خانہ اش شب را روز و روز را شب کردے۔ دیوانش از نظرِ مرزا بخوبی گزشتہ بلکہ بقول بعضے ہمہ کلامش گفتۂ مرزاست"

گلزار ابراہیم اور گلشن ہند میں بھی اس واقعہ کو محض افواہ اور گمان پر محمول کیا گیا ہی۔ عبارت یہ ہی:

"اکثر یہ گمان باشندگانِ شاہجہان آباد تھا کہ یقین فنِ شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے اور نام اس کا داخلِ اشعار کرتے تھے"

تذکرہ بزمِ گلشن گفتار میں بھی اسی مضمون کو دوسری طرح ادا کیا گیا ہی کہ:

"درخدمتِ مرزا رسوخ تمام داشت بنابرایں مرزا خود بہ تخلص یقین ارشاد فرمودند"

ڈاکٹر اسپرنگر اور ولیم بیل نے "ہمہ کلامش" کو "اکثر اشعار" سے بدل کر لکھا ہی کہ:

"مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ استاد کو ان سے ایسی محبت تھی کہ ان کے اکثر اشعار ان کو لکھ دیتے تھے۔"

ان میں سے ایک مؤلف بھی ایسا نہیں ہے جو یقین کے زمانے میں موجود ہو اور جس نے خود اس افواہ کو سنا ہو۔ گویا ان لوگوں کو یہ خبر افواہ در افواہ ہو کر پہنچی ہے اور افواہ ہی سمجھکر انھوں نے اس کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

طبقۂ سوم میں میر تقی میرؔ (نکات الشعرا) حسن (تذکرۂ شعرائے اُردو) اور گارسان دی تاسی (تذکرۂ ادبِ ہندوستان) شامل ہیں۔ ان سب کی واقفیت کا دار و مدار میر صاحب کے تذکرہ (نکات الشعرا) پر ہے۔ معلوم نہیں کہ میر صاحب کو یقین سے اتنی کد کیوں تھی کہ اس افواہ کو ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے حوالے دیئے ہیں۔ چونکہ میر صاحب ہی کے بیان پر یہ ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے اس لئے جو کچھ اُنھوں نے اس بارے میں لکھا ہے اس کو پورے کا پورا یہاں نقل کر دیتا ہوں تاکہ واقعات کے ساتھ میر صاحب کا جوشش بھی ظاہر ہو سکے:

"بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں راہ مردمان گمان ناموزونیت درحقِ او داشتہ باشند۔ جمعے برایں اتفاق دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست۔ چرا کہ شاعر ایں قسم کم فہم نمی باشد از شخصے منقول ست کہ بخانۂ عظیۃ اللہ خاں کہ پسر نواب عنایت اللہ خاں مرحوم

باشد یقین نشستہ بود و می گفت ازاں روزے کہ مرزا دستِ استادی درسرِمن داشتہ است شعرِمن ترقی کردہ تخیص مذکور ایں مصرعِ نظامی پیشِ حضار مجلس بآوازِ بلند خواند مصرع ؎ شد آں مرغ کو خایہ زرّیں نہاد ۔ حاصل او را بیضہ درکلاہ شکست ۔ میاں شہاب الدین ثاقب[۱] کہ احوالِ او نوشتہ خواہد شد نقل می کرد کہ من محض برائے امتحان بخانہ اور فتم و یک غزل طرح کردم من غزل با نصرام رسانیدم وازو مصرعے موزوں نہ شدہ واللہ اعلم ۔

میاں محمد حسین کلیم[۲] کہ احوالش گزشت قصیدۂ گفتہ ہست مسمیٰ بہ روضۃ الشعراء درو نام تمام شعراء را نقل کردہ ازاں جملہ نام ایشاں نیز آوردہ لیکن بکنایۂ غریبے کہ سخن فہم می فہمد و آں اینست ؎

---

[۱] شہاب الدین ثاقب ۔ بارھہ کے رہنے والے تھے ۔ دہلی میں آرہے تھے ۔ پہلے میاں آبرو کے شاگرد ہوئے اس کے بعد ان سے ٹوٹ کر سراج الدین علی خاں آرزو سے آملے ۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ باوجود ان کے بیان کو قبول کرنے کے میر صاحب ان کو بھی کچھ اچھا آدمی نہیں سمجھتے فرماتے ہیں۔ " تحفۂ روزگار ست ۔ درہمہ چیز دست دارد وہیچ نمی داند "

[۲] شیخ محمد حسین کلیم دہلوی ۔ یہ میر تقی میر کے بہنوئی ہیں ۔ احمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں پولیس میں ملازم تھے اور اپنے علم کی وجہ سے ہر جگہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ رسالہ علم عروض و قافیہ اور ترجمہ فصوص الحکم ان سے یادگار ہیں ۔ خود بھی شاعر تھے ۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ ان کی بعض مثنویاں بہت مشہور ہیں ۔ دیوان میں غزلیں قصیدے مخمس اور رباعیاں ہیں ۔ ان ہی قصیدوں میں قصیدۂ روضۃ الشعرا ہے ۔ احمد شاہ ہی کے زمانہ میں ان کا انتقال دہلی میں ہوا ۔ ۱۲

یقیں کے شعروں پہ ہیں بدگمان یعنے کہ اس کے ہیں

غلط ہے ہم نے پوچھا ہے گا مرزا جانِ جاناں کو "

اس میں پہلا جو واقعہ دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہی فساد کی جڑ ہے۔ یعنی یہ کہ میر صاحب نے یقین سے ملاقات کی اور اس کو کم فہم پایا۔ اب اس واقعہ کے ساتھ ان حالات پر بھی نظر ڈالیے جو اس ملاقات میں پیش آ سکتے ہیں۔ دنیا بھر جانتی ہے کہ میر صاحب بلا کے بددماغ آدمی تھے۔ یہ جا کر یقین کے دادا سے ملے۔ وہ ان کے ساتھ برابری سے پیش آئے، دعوت کی، شعر و شاعری ہوئی۔ یہ سرہند سے خوش خوش آئے اور شیخ عبدالاحد کی تعریف اپنے تذکرہ میں بے ضرورت کر دی۔ اب یہ یقین سے ملتے ہیں۔ وہ سرہند کے فقیر کا گھر تھا یہ دہلی کے ایک امیر کا محل ہے۔ وہاں ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے اور یہاں ایک نوجوان لڑکا وہاں انکساری تھی اور یہاں مرزا منشی اور نازک فراجی، وہاں کسی کو برابری کا دعویٰ نہ تھا اور یہاں یہ زور تھا کہ ؎

یقیں تائیدِ حق سے شعر کے میداں کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کون آ سکتا ہے کیا قدرت

بھلا ایسی صورت میں میر صاحب کا سرہند والا رنگ ڈھونڈنا تحصیلِ حاصل تھا ان کے کسی شعر کی تعریف نہ کی ہو گی جو یقین کو کم فہم ٹھیرا کر صلواتیں سنانے پر اُتر آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی ملاقات کی وجہ سے یہ خیالات یقین کے متعلق

ظاہر کئے گئے ہیں :

"بروپوچے چندے کہ بافتہ است کہ ما وشما نیز می توانیم بافت ۔ ایں قدر برخود چیدہ است کہ رعونتِ فرعون پیشِ او پشتِ دست بر زمیں می گزارد"۔

کیوں کہ اس کے بعد ہی لکھتے ہیں کہ:

"بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد"۔

دوسرا واقعہ کس کی زبانی سُنا اس کا اظہار نہیں کیا گیا ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ نظامی کے مصرعہ میں وہ کون سی بات تھی جس سے "(یقین) رابفیہ درکلاہ شکست" کی صورت پیدا ہوئی تھی ۔ اگر مرزا مظہر کا انتقال ہوگیا ہوتا یا اصلاح ترک کرنے سے یقین کی شاعری گر گئی ہوتی یا کوئی ایسی وجہ ہوتی جس کے باعث یقین کو شرمندہ ہونا پڑتا تو البتہ یہ قصہ بامعنی اور برمحل ہوتا ۔ یہاں تو یہی اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جس کسی نے یقین کے خلاف کچھ کہا اس کو میر صاحب نے خدا کی دین سمجھکر اپنے تذکرے میں جگہ دیدی ۔

تیسرا قصہ میاں شہاب الدین ثاقب کی زبانی نقل کیا ہے ۔ بھلا کیا ثاقب اور کیا ثاقب کی شاعری ۔ بڈھے پھونس ۔ فقیر آدمی آبرو کے شاگرد، ان کو انعام اللہ خاں یقین جیسا لونڈا کیا خاطر میں لاتا ۔ آپ جس طرح اس کا امتحان لینے گئے تھے، اسی طرح منہ کی کھاکر واپس آئے ۔ جلے ہوئے تو تھے مارتے ہیں، انھوں نے بھی اس کو نالائق مشہور کر دیا ۔

بات یہ ہے کہ اچھا شاعر شعر اُسی وقت کہتا ہے جب طبیعت حاضر ہو۔ کلام میں آمد کا رنگ رہے اور لفظوں اور بندشوں پر غور ہو سکے نہ اس طرح کہ ثاقب جیسے کوئی صاحب آکر کہیں کہ لیجئے یہ طرح ہے میں بھی کہتا ہوں، آپ بھی کہئے چھوٹے موٹے شاعر تو اس پر تیار ہو جائینگے مگر وہ لوگ جو واقعی شاعر ہیں وہی کرینگے جو یقین نے کیا کہ خالی کاغذ واپس کر دیا۔ اگر ایک آدھ مصرعہ بھی لکھ لیا ہوتا تو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اس نے طبیعت پر زور ڈالا ہے۔ سادہ کاغذ واپس کر دینے کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس نے ایسی لغویات میں پڑنا نہیں چاہا۔

چوتھا واقعہ محمد حسین کلیم کا ہے۔ کلیم کا شعر موجود ہے۔ ہر شخص اس کے معنی کر سکتا ہے مگر میر صاحب نے اپنے مطلب کے معنی پہنا کر لکھا ہے کہ:

"نامِ ایشاں را نیز آوردہ لیکن بجائے غریبے کہ سخن فہم می فہمد۔"

سارے قصیدہ میں بیچارے کلیم نے کسی شاعر کے متعلق کنایتاً کوئی بیان نہیں کیا ہے اور کیا ہے تو یقین کے لئے۔ جو شخص اس شعر کے وہ معنی سمجھے جو میر صاحب چاہتے ہیں وہ تو "سخن فہم" ہے ورنہ "کم فہم" اور "ذائقۂ شعر فہمی مطلق نہ دارد۔"

ذرا آگے چل کر یقین کے ایک شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"لیکن شعر یقین لفظاً لفظاً مبتدل رائے انند رام مخلص[1] ست"

---

[1] رائے انند رام مخلص۔ ذات کے کھتری اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ مرزا بیدل اور خان آرزو سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا اکثر کلام زبانِ فارسی میں ہے۔ مدتوں نواب اعتماد الدولہ وزیر کے وکیل رہے ۱۱۶۴ھ میں فوت ہوئے۔

اور ساتھ ہی اس کے مخلص پر بھی ہاتھ مار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"طرفہ تر ایں کہ آں ہم در سلیقۂ سرقہ یگہ بودہ است"

بہرحال واقعات کے لحاظ سے مجھے میر صاحب کی رائے پر اعتماد کرنے میں ذرا تامل ہوتا ہے۔ ہاں یہ مان لینے میں مجھے کیا کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ بلحاظ تعلقات (جس کا میں آیندہ ذکر کروں گا) مرزا مظہر کو اپنے اس شاگرد سے خاص انس تھا اور اُنھوں نے ان کے کلام کی اصلاح خاص طور پر کی ہے۔

میر صاحب کو چوں کہ یقین کے خلاف الزام قائم کرنا تھا اس لئے پہلے تو یہ ثابت کیا کہ یقین کو شعر کہنا نہیں آتا تھا، مرزا مظہر ان کو غزلیں لکھ دیا کرتے تھے، اس کے بعد جو ستم ظریفی کی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے فرماتے ہیں کہ:

"میان یقین را مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہد و وارث شعرہائے ریختہ خود گردانیدہ۔ از قبول کردن این معنیٰ بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بوارث می رسد الّا شعر۔ مثلاً کسے بر شعرِ پدر خود یا بر مضمونِ او متصرف شود ہمہ کس او را دزد خواہند گفت تا بشعرِ استاد چہ رسد۔"

یعنی آپ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یقین کو مرزا مظہر نے اپنے شعروں کا وارث کر دیا تھا۔ میری رائے میں ایسے وارثوں کو چور کہتے ہیں۔ گویا ایک طرف تو یقین کو ناکارہ ثابت کر کے راستہ بند کر دیا۔ دوسری طرف وارث کے خیال کی تردید کر دی۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں رہ گئیں کہ یا تو

یہ مان لو کہ یقین کا سارا دیوان مرزا مظہر کا ہے یا یہ تسلیم کرو کہ یقین نے ان کے شعروں کا سرقہ کیا ہے۔

بس میر صاحب ہی ایک شخص ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو دنیا میں پھیلایا۔ اس کے بعد ہر ایک نے ان سے سند لینی شروع کی۔ خود کسی نے تحقیق کی تکلیف گوارا نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں میر صاحب کے الفاظ بدل کر کچھ اور ہی ہو گئے۔ میر حسن اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں کہ :

"میر تقی در تذکرہ خود نوشتہ است کہ مشہور چنیں ست کہ مرزا مظہر تمام دیوان گفتہ دادہ است خود موزوں نیست مرا یقین نہ بود لیکن مرزا رفیع سودا و میر سوز سلمہا اللہ گواہی دادند کہ روزے مایاں در خانہ انعام اللہ خاں رفتہ برائے امتحان مصرعے طرح نمودیم۔ ہر چند مبالغہ کردیم یک مصرع موزوں نکرد ذائقہ سخن فہمی ہم نداشت۔"

اس کے بعد میر حسن خود اپنے خیالات لکھتے ہیں کہ :

"واللہ اعلم، باشد مارا ازیں چہ کار۔ متاعِ نیک ہر دوکاں کہ باشد۔"

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ میر حسن نے عبارتِ بالا کہاں سے پیدا کر لی نکات الشعرا میں تو یہ کہیں نہیں ہے۔ جو واقعات اس میں دیئے ہیں ان سے میں اوپر بحث کر آیا ہوں شاید نکات الشعرا کا کوئی دوسرا نسخہ دیکھا ہو گا۔ جو نسخہ انجمن ترقی اردو نے چھاپا ہے اس میں تو یہ فقرہ موجود نہیں ہے۔ یہی کیا ہے۔ دی تاسی اس سے بھی کچھ زیادہ

لکھتے ہیں اور وہ بھی نکات الشعرا ہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ دیکھئے اس طرح پر کا کوّا بن جاتا ہے۔ دی تاسی نے میر صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"اس شاعر (یقین) کی شہرت اگرچہ بہت زیادہ ہے لیکن جتنا کہا جاتا ہے اتنا نہیں ہے۔ ... اور اس کو اس لیے بھی برا کہا جاتا ہے کہ یہ بعض دوسرے شاعروں کی طرح کہیں تو دوسروں کے مضمون چرا لیتا ہے اور کہیں مصرعے ...... اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یقین کو نہ تو شعر کہنے کا مادّہ تھا اور نہ شعور تھا۔"

ذرا ان الفاظ کو نکات الشعرا کے مضمون سے ملا کر دیکھئے۔ کیا میر صاحب کا یہی مطلب تھا جو دی تاسی نے لیا ہے۔ بہرحال انعام اللہ خاں یقین کو نالائق ٹھیرانے میں بس میر صاحب ہی میر صاحب ہیں۔ انھوں نے اس پر ہی بس نہیں کی ہے بلکہ توارد کا بھی الزام بیچارے پر لگا دیا ہے اور تائید میں صرف ایک شعر لکھ کر چپ ہو گئے ہیں یقین کا شعر ہے ؎

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامہ کا بند | برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطّر ہو گیا

میر صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ شعر "لفظاً لفظاً متبدل رائے انندرام مخلص است ؎

ناخن تمام گشت معطّر چو برگ گل | بندے قبائے کیست کہ وا می کنیم ما"

اس بحث کو لچھمی نراین شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعرا میں بہت وضاحت سے

لکھا ہے اور میر صاحب کو بہت برا بھلا کہہ کر بتایا ہے کہ توارد اور تبدّل کس کو کہتے ہیں مجھے اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اول تو ایک شعر کی بنا پر کسی شاعر پر یہ الزام قائم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سرقہ کا عادی ہے یا اس کے ہاں توارد کثرت سے واقع ہوتا ہے۔ دوسرے ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی شعر کا ترجمہ کرنا نہ معیوب ہے اور نہ اس کو توارد کہا جاتا ہے اگر اسی چیز کو توارد سے تعبیر کیا جائے تو شاید زبانِ اُردو کا تو ایک شاعر بھی نہ رہے جس کو سارق نہ کہا جا سکے ہمارے یہاں کی شاعری بالکل ایک محدود دائرہ میں ہوتی ہے۔ ایک شاعر جو مضمون باندھ گیا ہے اسی کو الٹ پلٹ کر دوسرا باندھتا ہے۔ کبھی دوسری زبان کے اشعار سے ترجمہ کرتا ہے۔ غرض اس طرح اگر ایک طرف جدّت پیدا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف مضمون میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر صرف ایک شعر کے ترجمہ کی بنا پر یہ الزام قائم کیا جائے کہ یقین دوسرے شعرا کے مضامین کا سرقہ کرتا تھا، تو میرؔ اور سوداؔ جیسے شاعر بھی اس الزام سے نہ بچ سکیں گے۔ نمونہ کے لئے سوداؔ اور میرؔ کا ایک ایک شعر دیئے دیتا ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ لوگ بھی ترجمہ کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ سوداؔ کا یہ شعر

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو ۔۔۔ اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

قدسی کے اس شعر کا ترجمہ ہے ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را ۔۔۔ اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

اور

میر صاحب کا یہ شعر ؎

عام حکمِ شراب کرتا ہوں　　محتسب کو کباب کرتا ہوں

حضرت امیر خسرو کے اس شعر کی نقل ہے

عام حکمِ شراب می خواہم　　محتسب را کباب می خواہم

میرؔ اور سوداؔ ہی پر کیا موقوف ہے جب سے اُردو کی بنیاد پڑی اس وقت سے دوسری زبان سے ترجمہ کرنے کو جائز سمجھا گیا ہے اُردو کے باوا آدم "ولی" کو دیکھئے حسن کے شعر ؎

شب مرا تا بروز خواب نہ بود　　در دو چشم بغیرِ آب نہ بود

کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ ؎

آج گی رین مجھکو خواب نہ تھا　　دونوں آنکھوں میں میری آب نہ تھا

غرض یقین پر میر صاحب کا یہ الزام بہت ہی کمزور ہے۔ مخالفت میں لکھ گئے۔ یہ نہ سمجھے کہ جو اصول میں قائم کر رہا ہوں اس سے خود بھی نہیں بچ سکتا۔ شفیق اورنگ آبادی نے تذکرہ چمنستانِ شعرا میں اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ نتیجہ وہی ہے جو میں نے نکالا ہے۔ ہاں یہ ضروری کہ اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ "توارد" اور "متبدل" کس کو کہتے ہیں۔ اور کون سی صورتوں میں یہ الزام کس شاعر پر عاید کیا جا سکتا ہے۔

چوتھا طبقہ ان تذکرہ نویسوں کا ہے جنھوں نے اس الزام کی تردید کی ہے۔

ان میں سے ایک تو شیفتہ ہیں جن کا ذکر میں توارد کی بحث میں کر آیا ہوں۔ دوسرے قدرت اللہ شوق ہیں اور تیسرے مولوی عبدالحی صاحب۔ شوق نے لکھا ہے کہ:

"بعضے شعرا گمان بردہ اند کہ یقین شعر گفتن نمی دانست۔ مرزا مظہر اورا شعر گفتہ می داد محض خطا است۔ فاما در اشعارش اکثر اصلاحِ استاد بیشتر ست چیزے مضائقہ ندارد۔"

شوق نے یہ تذکرہ دہلی میں ۱۱۸۱ھ میں تکمیل کو پہنچایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا مظہر زندہ تھے یقین کے دیکھنے والے لوگ موجود تھے۔ خود شوق اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے وہاں مرجع خلائق تھے۔ ایسی صورت میں قیاس یہی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا بعد تحقیقات لکھا۔ یا ان کا ایسے صاف صاف الفاظ میں اس واقعہ کی تردید کرنا ظاہر کر رہا ہے کہ ان کو اپنی تحقیقات پر اعتماد ہے اور وہ اس افواہ کو "محض خطا" سمجھتے ہیں۔ چونکہ مولوی عبدالحی صاحب کا زمانہ بہت بعد کا ہے اور بطور خود تحقیقات کرنے کا انھیں موقع نہ تھا اس لئے انھوں نے اس واقعہ کی تردید کا دوسرا پہلو اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"میر صاحب کی زبردستی دیکھو یقین کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ شہادت موجود ہے۔ ایسے سخنگو کی سخن فہمی سے انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے اچھا نہیں لگتا۔"

یہ تو وہ رائے ہے جو دوسرے تذکروں کے بیانات پر قائم کی گئی یا قائم کی جا سکتی ہے۔ اب میں خود اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا اور

میری رائے گیا۔

"توارد اور متبدل" کے متعلق اوپر بحث کر آیا ہوں آگے چل کر میں اور اشعار بھی دوں گا اور دکھاؤں گا کہ یقین نے دوسرے شاعروں سے مضمون لے کر اس کو کیا سے کیا کر دیا ہے۔ یہاں میں صرف اس الزام سے بحث کرنا چاہتا ہوں کہ یقین خود شاعر نہ تھا بلکہ اس کا تمام دیوان مرزا مظہر جان جاناں کا کہا ہوا ہے۔

مرزا مظہر کے حالات جس کتاب میں چاہو اٹھا کر دیکھ لو یہی پاؤ گے کہ انھوں نے اُردو میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا اور صرف فارسی میں شعر کہتے تھے۔ شاید[1] اس کی وجہ یہ معلوم تھی کہ جب یقین کے کلام کی شہرت ہوئی اور شاگرد کے کلام سے استاد کا کلام دبنے لگا تو عبدالحی[2] تاباں نے جو مرزا مظہر کے بہت منھ چڑھے ہوئے تھے،

---

[1] مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ واقعہ کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ یقین کے شہرت کلام کی وجہ سے تاباں نے مرزا مظہر کو ریختہ گوئی سے منع کر دیا۔ میری سہل انگاری تھی کہ اس واقعہ کا نوٹ کرنا بھول گیا اس کے بعد حافظہ پر زور ڈال ڈال کر سیکڑوں ہی کتابیں الٹ ڈالیں پھر بھی پتا نہ چلا۔ لاچار اس واقعہ کو "شاید" کا تاج پہنا کر صرف رائے کی صورت میں لکھتا ہوں۔ [2] میر عبدالحی تاباں علوی سید اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ ظاہری حسن و جمال کے ساتھ طبیعت بھی لاجواب لے کر آئے تھے شاعری سے خداداد مناسبت تھی پہلے محمد علی حشمت کے شاگرد ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں استاد سے بڑھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اپنا کلام شاہ حاتم کو بھی دکھایا۔ اس شاگردی کا اعتراف انھوں نے کئی جگہ اپنے کلام میں کیا ہے۔ ان کو شراب کی ایسی لت پڑی کہ جوانی ہی میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا کلام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ زبان ایسی لطیف اور روانی اس غضب کی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میرے پاس ان کے دیوان کا نسخہ موجود ہے اگر فرصت نے موقع اور دل و دماغ نے کام دیا تو کسی نہ کسی دن ان کا دیوان بھی مرتب کر کے شائع کروں گا۔

ان کو اُردو میں شعر کہنے سے منع کیا۔ اور مرزا صاحب نے بھی اس کو تسلیم کر کے "ریختہ گوئی" ترک کردی۔ مرزا صاحب کا جو تھوڑا بہت کلام پہلے کا تھا وہ رہ گیا اور اس کو تبرک کی طرح لوگ اب آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اس واقعہ کو مصحفی نے یوں لکھا ہے کہ:

"چوں دراں روزہا میر عبدالحی تاباں دوستی بشدّت تمام داشت، چند غزلیات متعددہ از خامۂ فکرات ایشاں (مرزا مظہر) بر صفحہ کاغذ ریختہ بودند۔ مشارٌالیہ مانع آمد۔ آخر ایشاں قرار شعر گفتن خود بزبان فارسی دادند و بعد ازیں بر ریختہ زبان نیالودند۔ مگر ہماں قدر کہ باصلاح دو سہ شاگرداں بکار آید۔"

اس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر اپنے جوش کو روک نہیں سکتا۔ اس لئے وہ خود غزلیں لکھتے تھے اور یقین کا نام ڈال دیتے تھے۔ اس کا جواب بالکل صاف ہے۔ اگر مرزا صاحب کا جوشِ شاعری کسی طرح نہیں رُک سکتا تھا تو یقین کے مرنے کے بعد وہ کیوں یکایک غائب ہوگیا۔ یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ہوا اور مرزا صاحب ۱۱۹۵ھ میں شہید ہوئے۔ پھر آخر ۲۶ سال تک یہ جوشِ ریختہ گوئی کہاں چلا گیا۔ کیوں کہ یقین کے علاوہ ان کے اور کسی شاگرد کے متعلق نہیں کہا جاتا کہ اس کو مرزا صاحب خود شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔

اس کے بعد خود ان دونوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے۔ کیا کوئی کہنے کی جرأت رکھتا ہے کہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے ہیں۔ میر صاحب اتنے بڑے شاعرِ سخن سنج

وسخن فہم ہو کر یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ میں نے دونوں کا کلام دیکھا، مجھے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ حسن یا کوئی دوسرے تذکرہ نویس اس پہلو سے اس واقعہ کی تائید میں کوئی رائے ظاہر کرتے تو مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت ہوتی۔ ان کا اس واقعہ پر اس پہلو سے نظر نہ ڈالنا گو ثبوت قطعی نہ ہو مگر رجحان ضرور پیدا کرتا ہے کہ وہ کلام کی بنا پر یہ الزام ثابت نہیں کر سکتے۔ یقین کا دیوان اب چھپ رہا ہے۔ مرزا صاحب کا کلام ہر تذکرے میں موجود ہے، آپ خود ملا کر دیکھ لیجئے۔

مرزا صاحب کے ہاں متانت ہے تو یقین کے ہاں شوخی۔ اُن کے ہاں بڈھوں کی سی باتیں ہیں تو ان کے ہاں جوانی کا جوش۔ اُن کے ہاں لفظوں کی بہتات ہے تو ان کے ہاں قلبی کیفیات کا اظہار۔ اُن کے ہاں حقیقت کا رخ ہے تو ان کے ہاں مجاز کا پہلو۔ غرض دونوں کے کلام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اس بحث پر میں ایک خاص پہلو سے بھی نظر ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جس خاص مضمون سے کسی شاعر کو شوق ہوتا ہے وہ طرح طرح سے اس کو اپنے اشعار میں لاتا ہے۔ یقین کو شیریں و فرہاد کے قصّے سے کچھ خاص دلچسپی تھی (شاید اس لئے ہو کہ وہ فرہاد کی طرح مارے جانے والے تھے) اور انھوں نے اتنے چھوٹے سے دیوان میں ۳۸ جگہ اس قصہ کو تلمیحاً نئے نئے پہلوؤں سے باندھا ہے۔ اگر واقعی مرزا صاحب ہی نے یقین کا دیوان کہا ہے تو کہیں ایک جگہ تو وہ اپنے کلام میں بھی اس قصّے کو لاتے۔ ان کے سارے کلام میں ایک جگہ بھی شیریں فرہاد کا

ذکر نہیں آیا ہے۔ میں نے مرزا صاحب کا فارسی دیوان بھی دیکھا، اس میں اس قصے کے لوگوں کے نام صرف ۹ جگہ آتے ہیں اور وہ بھی اکثر استعارۃً۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں:

(مظہر)

دید چوں خوش کاریم در کندنِ جاں کوہکن ‏ ‏ از زبانِ تیشہ کرد اقرارِ استادی مرا

بکوہستاں بنال و گوش کن از دردِ محرومی ‏ ‏ روانِ کوہکن تا حال در کہسار می نالد

ہر کجا من نگرم جوئے روانی در کوہ ‏ ‏ سر بسنگے زنم و ماتمِ فرہاد کنم

مرزا مظہر کا ایک ہی شعر ایسا ہے جو یقینؔ کے ایک شعر سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھنے سے میرے بیان کی تائید ہو جائیگی کہ دونوں شاعروں کا طرزِ ادا کس قدر مختلف ہے۔

مرزا مظہر فرماتے ہیں ؎

می تواں انصاف کرد آخر کہ اوّل حق کیست ‏ ‏ در ہلاکِ کوہکن پرویز بے تقصیر بود

دیکھئے یقینؔ اس مضمون کو کس شوخی سے ادا کرتے ہیں ؎

مارے ہی جاتے ہیں آخر کوہکن سے سرچڑھے ‏ ‏ خسروِ بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں شعر ایک ہی شاعر کے دماغ سے نکلے ہیں۔ ایک منطق لے کر بیٹھے ہیں، دوسرے نے محض دنیا کا رنگ دیکھکر کہدیا کہ ایسے لوگ جوتیاں ہی کھاتے ہیں بھلا کسی دوسرے کا اس میں کیا قصور۔

مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب نے

یقین کو اصلاح دینے میں خاص توجہ کی ہے اور یہی خیال اکثر و بیشتر تذکرہ نویسوں کا ہے۔ مجھے مرزا صاحب کے اکثر شاگردوں کے دیوان دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی شاگرد ہوگا جس نے اپنے دیوان میں استاد کی تعریف نہ کی ہو۔ خواجہ احسن اللہ بیان[1] لکھتے ہیں ؎

بندہ ہے تنا حضرتِ استاد کی کیا ہو — مظہر ہے خداوند کی وہ ذاتِ اتم کا

محمد باقر حزیں[2] کہتے ہیں ؎

اے حزیں شکر کہ ہے مصحفِ اربابِ جنوں — فیض سے حضرتِ مظہر کے یہ دیواں میرا

محمد فقیہ دردمند[3] لکھتے ہیں ؎

---

[1] خواجہ احسن اللہ بیان۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں آ رہے تھے۔ مرزا مظہر کے شاگرد ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں صاحب دیوان ہو گئے۔ دہلی سے نکل حیدر آباد پہنچے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ اکثر غزلیں ۵-۵ شعروں کی ہیں ان کا رنگ یقین کے رنگ سے بہت ملتا ہے مگر یقین کی سی شوخی نہیں ہے [2] محمد باقر حزیں دہلوی۔ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ جب دہلی پر تباہی آئی تو یہ عظیم آباد چلے گئے اور نواب سعید احمد خاں صولت جنگ کی مصاحبت میں اچھی طرح زندگی گزار گئے۔ بہت فہمیدہ اور یار باش آدمی تھے صاحب دیوان ہیں۔ [3] محمد فقیہ دردمند اودگیر (دکن) کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۳۶ھ میں باپ کے ساتھ دہلی آئے۔ یہاں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مرزا مظہر نے ان کو پالا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مرزا صاحب کے مرید اور شاگرد ہو گئے دہلی سے یکایک دل ایسا اچاٹ ہوا کہ یہاں سے نکل سیدھے عظیم آباد پہنچے اور وہاں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے ملازم ہو گئے۔ وہاں بھی دل نہ لگا تو پھر دہلی آئے یہاں کی تباہی سے پریشان ہو کر مرشد آباد گئے اور وہیں ۱۱۷۶ھ میں انتقال کیا۔ فن سخن میں استاد اور طریقۂ مصاحبت میں ماہر تھے۔ ان کا فارسی دیوان اور ساقی نامہ بہت مشہور ہے۔

خدیوِ سخن میرزا جانِ جاں ۔۔۔ کہ حکم اس کا ہے ناطقہ پر رواں
لقب اس کا ہے ذوالجلالِ سخن ۔۔۔ کہ بندے ہیں اس کے سب اربابِ فن
کوئی آج اس کے برابر نہیں ۔۔۔ وہ سب کچھ ہے الّا پیمبر نہیں

اور انعام اللہ خاں یقین نے تو بجا استاد کی تعریف کی ہے۔ مرزا مظہر کو اپنے شاگرد سے جو اُنس تھا اس کے لئے ان کا کلام دیکھو۔ جوہرِ قابل کی قدر کرتے تھے درد مند کے متعلق فرماتے ہیں ؎

مظہر مباش غافل از احوالِ درد مند ۔۔۔ لعلے ست ایں کہ در گرہِ روزگار نیست

جب درد مند کے حال پر مرزا صاحب کی یہ نظرِ عنایت تھی تو انعام اللہ خاں یقین کے لئے تو جو کچھ بھی کرتے وہ کم تھا۔ مرزا صاحب چار بزرگوں سے بیعت ہوئے (۱) نور محمد بدایونیؒ (۲) حاجی محمد افضل (۳) حافظ سعد اللہ۔ (۴) محمد عابد۔ ان چاروں بزرگوں کا سلسلہ ایک ہی واسطہ سے یقین کے دادا سے جا ملا ہے۔ پہلے تین بزرگوں کا سلسلہ تو شیخ محمد معصوم تک پہنچتا ہے اور چوتھے بزرگ کا شیخ عبدالاحد سے یہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ شیخ محمد معصوم اور شیخ عبدالاحد سگے بھائی تھے۔ اس کے علاوہ ایک یہ بھی تعلق تھا کہ شیخ عبدالاحد نے اپنے بھائی شیخ محمد معصوم سے بیعت کر لی تھی۔ مرزا مظہرؒ کا نام ان کی شاعری سے نہیں ہے۔ ان کی بزرگی و تقدس سے ہے۔ اس لئے ان تعلقات کو پیش نظر رکھکر اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ مرزا صاحب نے یقین کی تربیت کی طرف خاص توجہ

کی تھی تو وہ ہر طرح قابلِ قبول ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہمارے نوجوان شاعر بڑھاپے کے مضامین اور بڈھے شاعر جوانی کے مضمون باندھتے ہیں مگر باوجود اس کے میں تو یہاں تک ماننے کو تیار ہوں کہ اصلاح کے وقت خود مرزا صاحب نے بعض شعر ممکن ہے اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہوں اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔ میں ان اشعار کو نیچے دیتا ہوں جن کے متعلق شبہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی بڈھے کہنہ مشق اور متین شخص کے کہے ہوئے ہیں اور ان میں وہ شوخی اور چہل نہیں ہے جس سے یقینؔ کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے ؎

۱۔ سمجھتا قدر میرے ضعفِ پیری کی سجن جب تجھے — جو تجھ سا کوئی تیرے تیر سے قد کو کماں کرتا

۲۔ عشق کو ایامِ پیری میں یقینؔ موقوف رکھ — کیوں بچھڑتا ہے بڑھاپے میں جوانوں کو نہ چھیڑ

۳۔ ناتوانی سے اسے جور و جفا کی تاب نہیں — اب یقینؔ بوڑھا ہوا۔ اے نوجوانان الوداع

۴۔ چھوڑتا عشق نہیں مجھکو تو مانندِ سحر — ہوگیا پیر۔ گریباں ہے مرا چاک ہنوز

۵۔ بڑھاپے میں یقینؔ کے جامِ مے سے دستگیری کر — شرابِ کہنہ ہے اس دردِ پیری کی دوا ساقی

بس تمام دیوان میں اسی قدر شعر ہیں جن سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ کسی بیس پچیس برس کے نوجوان شخص کی قلم سے شاید نہ نکلے ہوں اور ان میں وہ جوش اور رنگ بھی نہیں ہے جس سے یقینؔ کا دیوان رنگا ہوا ہے۔ اس لئے ان کے متعلق یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ مرزا مظہر نے اصلاحِ غزل کے وقت یا تو ان کو بڑھا دیا ہے یا یقینؔ کے اشعار کے الفاظ تبدیل کر کے ان کو یہ شکل دیدی ہے۔ اس کے مقابل میں وہ شعر دیکھو جو یقینؔ نے استاد کی تعریف میں کہے ہیں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی استاد ایسا

بے حمیّت ہوگا کہ خود اپنی تعریف کرکے شاگرد کے دیوان میں اس کو داخل کرے۔
مرزا مظہر کی عالی ظرفی سے تذکرے بھرے پڑے ہیں اور ان کا شمار اولیاء کبار میں
ہوتا ہے، ان کے متعلق تو یہ قیاس بھی نہیں ہوسکتا کہ اُنھوں نے اپنی تعریف میں یہ
اشعار کہے ہونگے۔ اب وہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

۱- جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقیںؔ	حضرتِ استاد یعنی شاہِ مظہر کی ثنا
۲- مجھ سے پتھر کو کیا ہے جوں نگیں حرف آشنا	کون پہچانے یقیںؔ بن حضرتِ مظہر کی قدر
۳- سایہ بے شخص ٹھیرتا نہیں کہتا ہے یقیںؔ	آپ سے مجھکو جدا حضرتِ مظہر نہ کرو
۴- شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیںؔ	جب ہو استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے
۵- یقیںؔ کی گفتگو کے لطف کو بالفعل کب کوئی	بغیر از حضرتِ استاد مرزا جانِ جاں سمجھے

کیا خود شاعر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص شعر نمبر ۴ کہہ کر اس کے دیوان میں شریک کرسکتا ہے
اور اگر داخل کرنا بھی چاہے تو کیا وہ شاعر اس کا روادار ہوسکتا ہے اور کیا شعر نمبر ۵ میں جو تعلّی ہے
وہ خود اُستاد اپنے متعلق لکھ کر شاگرد کے شعروں میں شریک کرنا گوارا کرسکتا ہے اگر ان
شعروں کو کوئی یہ کہدے کہ مرزا مظہر کے ہوسکتے ہیں تو پھر اس کو اختیار ہے کہ یہ بھی کہدے
کہ یقین کا سارا دیوان مرزا صاحب کا کہا ہوا ہے کیوں کہ ان اشعار میں یقین کا رنگ موجود ہے۔
دیوان یقین | یقین کے دیوان حیدر آباد میں تو اکثر جگہ ہیں لیکن شمالی ہند میں ذرا کم ملتے ہیں۔
وہاں جو کچھ تھوڑے بہت نسخے تھے وہ یورپ کے کتب خانوں میں پہنچ گئے۔ اب کہیں
ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں ایک آدھ نسخہ رہ گیا ہو تو رہ گیا ہو۔ یقین کے

مرنے کے بعد ہی جو نسخہ اورنگ آباد پہنچا اس میں ۱۷۰ غزلیں اور ہر غزل میں ۵ شعر تھے
لچھمن نراین شفیق[1] اورنگ آبادی نے اس دیوان کی غزل پر غزل لکھ کر اپنا دیوان
پورا کیا اور آخر میں اشعار کی تعداد کو اس طرح ظاہر کیا ہے

شاہِ ملکِ سخن ستودہ جناب — نام جس کا یقینِ نیک صفات
ایک دیوان (ہے) نپٹ شیریں — جس کی لذت ہے مثلِ قند و نبات
زیر جتنے یقیں کے نام کے ہیں — اتنے ہی ریختے صفا کے ساتھ
یعنی وہ کل ہیں ایک سو ستر — آٹھ سو پر پچاس ہیں ابیات
اتنے ہی ریختے کہے میں نے — جس قدر میرے پر ہوئے اثبات
کُل کتابت یہ دونوں دیواں کی — ایک ہزار اور سات سو اور سات
ختم کر اب یہ گفتگو صاحب — سرورِ انبیا پہ بھیج صلوٰۃ
دل نے تاریخ بھی کہی اس کی — صاحب ناقص اور یقین کے نکات

۱۲۰۰ھ

میں نے جو یقین کے دیوان کے ۱۲ - ۱۳ نسخے دیکھکر اپنا نسخہ مرتب کیا ہے
اس میں بھی مل ملاکر زیادہ سے زیادہ (۱۷۰) غزلیں پانچ پانچ شعر کی ہوئی ہیں
یقین کی طبیعت میں بڑی جدت تھی اول تو ۵ - ۵ شعروں کی غزلوں کا التزام
ایک نئی چیز تھا۔ دوسرے دیوان میں ۱۷۰ غزلیں لکھیں جو ابجد کے لحاظ سے

---

[1] یہ ریختہ میں صاحب تخلص کرتے تھے ۱۲

ان کے تخلص کے حروف کے برابر ہیں۔ان کے اس رنگ نے یہاں تک زور پکڑا کہ دہلی تو دہلی، دکن میں بھی پانچ پانچ شعر کی غزلوں کا طریقہ پڑ گیا اور بہت دنوں تک قائم رہا۔

میں نے اپنے مرتبّہ دیوان کی غزلوں کا مقابلہ صاحب کے دیوان سے کیا جس میں یقین کی غزل پر غزل لکھنے کا التزام رکھا گیا ہے، تو اپنے نسخہ میں دو غزلیں ایسی پائیں جن کا جواب صاحب کے یہاں نہیں ہے۔ ایک کا تو مطلع یہ ہے:

ہے ترے داغ سے تر سینۂ سوزاں میرا　　آب رنگ آگ سے رکھتا ہے گلستاں میرا

اور دوسرے کا مطلع یہ ہے ؎

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زنداں کے بیچ　　آج زنجیر سے آتی ہے جھنک کان کے بیچ

اس کے مقابل میں صاحب نے یقین کے دیوان پر جو اپنا دیوان لکھا ہے اس میں ایک غزل ہے جس کا جواب میرے مرتبّہ دیوانِ یقین کے نسخہ میں نہیں ہے صاحب کی وہ غزل پوری لکھے دیتا ہوں ؎

آ کے مجلس میں ہم نے کام کئے　　چشمِ ساقی سے جام وام کئے
بسکہ کم ظرف تھے تنک میں چھلکے　　دو پیالوں میں دھوم دھام کئے
ریختوں کا یقیں کے بارے جواب　　شکرِ حق ہم نے انصرام کئے
ہم غلام علیؑ کے ہو کے غلام　　سروِ آزاد کو غلام کئے
ریختہ کی زباں کے صاحب ہو　　فارسی میں شفیق نام کئے

اس غزل کو گن بھی لیا جائے تو صاحب کی کُل ۱۶۹ غزلیں ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہی کہ یقین کی اس غزل کا جواب جس کی ردیف میرا اور قافیہ سوزان و گلستاں وغیرہ ہی اور جس کے اکثر اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ان کے دیوان کے اس نسخے میں نقل ہونے سے رہ گئی ہی جو حیدر آباد کے کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔
یقین کی ایک غزل ایسی ہی جس کے بعض اشعار کے متعلق کہا جاسکتا ہی کہ وہ جیسے ویسے شیخ شرف الدین مضمون کے ہاں موجود ہیں شفیق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس غزل میں یقین کا روزمرّہ نہیں ہی۔ اس لئے یہ شعر مضمون ہی کے ہونگے جو غلطی سے یقین کے دیوان میں لکھدیئے گئے۔ میر صاحب نے بھی اس غزل کو مضمون ہی کی لکھا ہے۔ غزل یہ ہی ۔

چلا آنکھوں سے جب کشتی ہوئی محبوب جاتا ہی — کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو دل ڈوب جاتا ہی

میری رائے بھی یہ ہی کہ یہ غزل مضمون کی ہی اور غلطی سے یقین کے ہاں لکھدی گئی ہی۔ کیوں کہ احسن اللہ بیان نے جو مرزا مظہر کے شاگرد تھے اپنی ایک غزل میں اس طرف اشارہ کیا ہی وہ لکھتے ہیں ۔

بیاں جب میں بیاں کرتا ہوں یہ مضمون مضموں کا — کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہی

چوں کہ یہ غزل تقریباً ان تمام نسخوں میں تھی جو میری نظر سے گزرے اور صاحب نے بھی اس کے جواب میں غزل لکھی ہی۔ اس لئے میں نے اس کو یقین کے دیوان میں جگہ دیدی ہے ورنہ میری رائے میں یقیناً یہ غزل یقین کی نہیں ہی۔ اس کے علاوہ ایک اور

غزل ہے جس کے بعض اشعار کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یقین کے نہیں ہیں - اس غزل کا مطلع ہے ؎

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زنداں کے بیچ ۔۔۔ آج زنجیر سے آتی ہے جھنک کان کے بیچ

میرا خیال ہے کہ یہ طرحی غزل تھی اور غلطی سے کرم اللہ خاں درد[1] کے بعض اشعار یقین کے ہاں کاتب نے لکھ دیئے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ غزل یقین کی نہ ہو کیوں کہ نہ تو اس کا جواب شفیق نے اپنے ہاں دیا ہے اور نہ یہ غزل سوا ایک نسخے کے جو سب سے پرانا ہے اور کسی دوسرے نسخے میں ہے - اور جس نسخہ میں یہ غزل درج ہے اس میں بھی حاشیہ پر لکھی ہوئی ہے - کرم اللہ خاں درد کی پوری غزل لکھ دیتا ہوں مقابلہ سے معلوم ہو جائے گا کہ کون کون سے اشعار مشترک ہیں -

عشق کی آگ لگی ہے مرے اب جان کے بیچ ۔۔۔ شمع ساحل کے بجھوں گا ابھی ایک آن کے بیچ

میں دِوانہ ہوں ترا مجھکو نہ مار اے ظالم ۔۔۔ قتل مجنوں کا پڑھا ہے کہیں قرآن کے بیچ

عقل اور ہوش گیا دیکھ کے غمزے کی فوج ۔۔۔ ایک دل اڑ کے رہا عشق کے میدان کے بیچ

یہ دو آنکھیں ہیں جو دریا سے لیتی ہیں خراج ۔۔۔ اب تو تم بھی نہیں ان دیدۂ گریان کے بیچ

سامنے ہوتے ہی پھر نعش نہ پائی دل کی ۔۔۔ بٹ گیا نوکِ سناں پر صفِ مژگان کے بیچ

زخمِ دل ہونے دے ناسور نہ کر اس کا علاج

درد میں جو کہ مزا ہے نہیں درمان کے بیچ

---

[1] کرم اللہ خاں درد - نواب عمدۃ الملک امیر خاں کے بھانجے اور بڑے خوش فکر شاعر اور یقین کے ہمعصر تھے

اسی طرح میں حشمت[1] اور فغاں[2] کی بھی غزلیں ہیں۔ حشمت کے مطلع کا ایک مصرعہ یقین کے مطلع کے ایک مصرعہ سے ملتا ہے۔ مگر دونوں مطلعوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

نکہتِ گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ ۔۔۔ پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

میرے کرم فرما عمر یافعی صاحب نے مجھکو یقین کے دیوان کا ایک نسخہ مولوی بسمل سے لاکر دیا تھا۔ اس میں ایک غزل ایسی ملی جو نہ تو کسی اور نسخے میں ہے اور نہ وہ یقین کا روزمرّہ ہے، پرانے زمانہ کے کسی معمولی شاعر کا کلام ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ غزل میں نے کبھی ایک بیاض میں دوسرے شاعر کے نام سے دیکھی ہے۔ حافظہ پر زور ڈالا، سیکڑوں بیاضوں کو چھان مارا لیکن پتا نہیں چلا۔ لیکن باوجود اس کے نہ تو میں اپنے حافظہ کو غلط کہہ سکتا ہوں اور نہ اس غزل کو یقین کے دیوان میں جگہ دینے کے لئے تیار ہوں یقین کا دیوان آپ کے سامنے ہے، غزل پوری کی پوری یہاں نقل کئے دیتا ہوں، آپ خود فیصلہ کرلیجئے کہ ایسی بحر غزل اس دیوان میں

---

[1] میر محتشم علی خاں حشمت خلف میر باقی ان کا آبائی وطن بدخشاں تھا۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ مغلپورہ میں رہتے تھے صحیح النسب سید اور سپاہی پیشہ آدمی تھے ۱۱۶۳ھ میں یکایک انتقال کیا۔

[2] اشرف علی خاں فغاں۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ اور امرائے دہلی میں سے تھے پہلے دہلی چھوڑ مرشد آباد گئے اور واپس آگئے اس کے بعد پٹنہ چلے گئے اور راجہ شتاب رائے کے ندیم خاص ہوگئے۔ آخر ۱۱۹۶ھ میں (نساخ نے سنہ انتقال ۱۱۸۶ھ لکھا ہے) انتقال کیا۔ میر تقی میر کا ان سے بڑا دوستانہ تھا۔ یہ اس قدر بامذاق آدمی تھے کہ ان کو ظریف الملک کا خطاب دیا گیا تھا ۱۲

جگہ پاسکتی ہے یا نہیں ؎

ہمارے عیش کی مجلس برہ کی آگ جالا ہے ۔ نہ گلشن ہے نہ موہن ہے نہ مطرب ہے نہ پیالا ہے

ہمن ہیں عشق کے جوگی ہمارے شوق مستی میں ۔ نہ تینک ہے نہ پوتھی ہے نہ سمرن ہے نہ مالا ہے

گیانے کو رقیبوں کے خدنگِ آہ بن میرے ۔ نہ نیزہ ہے نہ بلّم ہے نہ برچھی ہے نہ بھالا ہے

ترے رخ۔ زلف خط انکھیاں کی خوبی کا جمز الله ۔ نہ سنبل ہے نہ ریحاں ہے نہ نرگس ہے نہ لالا ہے

یقیں کی بے قراری اور فغاں سے آج آسودہ

نہ دریا ہے نہ باراں ہے نہ ندّی ہے نہ نالا ہے

میرے خیال میں یہ فغاں کی غزل ہے اور اس کا مقطع یوں ہے ؎

یقیں ہے بیقراری سے فغاں کی آج آسودہ ۔ نہ دریا ہے۔ نہ باراں ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

واللہ اعلم بالصواب

مجھے کریم الدین کے تذکرۂ طبقات الشعرا میں یہ دیکھکر بڑا تعجب ہوا کہ وہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے حوالے سے یقین کے دو دیوانوں کا ہونا بیان کرتے ہیں دراں حالیکہ گلشنِ بیخار میں شیفتہ نے صرف ایک دیوان کا ذکر کیا ہے۔ اس سے زیادہ پریشان مجھکو گارساں دی تاسی کے ایک اور بیان نے کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"بینی نراین[1] نے یقین کی بہت سی رباعیاں، مطلعے، غزلیں اور فردیات ۸۵

---

[1] بینی نراین جہان۔ ذات کے کھتری دہلی کے رہنے والے اور کھیم نراین رند کے پوتے تھے۔ پہلے یہ خاندان لاہور میں رہتا تھا وہاں سے دہلی میں آبسا۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ یکایک

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

ورقوں میں نقل کئے ہیں"۔

بینی نراین کے تذکرے کا نام دیوانِ جہان ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ رباعیاں مطلعے اور فردیات اس کو کہاں سے مل گئے۔ نہ کسی تذکرے میں ان کا کوئی ذکر ہے اور نہ یقین کے دیوان کے کسی قلمی نسخے میں ان کا اندراج ہے۔ میں نے دیوانِ جہان کی تلاش کی لیکن نہ مل سکا۔ یورپ کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھیں [illegible] یہی پایا کہ یقین کے دیوان میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ آخر جب بینی نراین کے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے پڑھی اس وقت چین آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"بینی نراین نے دیوانِ جہان میں تحقیق سے بالکل کام نہیں لیا ہے اور اس لئے اس کے انتخاب پر اعتبار نہ کرنا چاہیے"۔

میری بھی یہی رائے ہے کہ بینی نراین نے محمد حسین یقین اور ہندوستان کے تمام یقینوں کا کلام انعام اللہ خاں یقین سے منسوب کر دیا ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اتنے قلمی نسخوں میں کہیں ایک رباعی یا مطلع یا فرد نہ نکلتی۔ یہی غلطی محسن نے اپنے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) انقلاب زمانہ نے بالکل مفلس کر دیا اور بینی نراین کو دہلی چھوڑنی پڑی پھرتے پھراتے کلکتہ پہونچے۔ مولوی حیدر بخش نے ان کو ٹی روبک کے سامنے پیش کر دیا جو زبان اردو کے دلدادہ تھے۔ انہی کے کہنے سے بینی نراین نے ١٨١٤ء میں تذکرۂ شعرائے اردو لکھا اس کا نام دیوانِ جہان رکھا۔ اس کے علاوہ قصہ چہار درویش۔ چہار گلشن اور تنبیہ الغافلین ان سے یادگار ہیں یہ آخری کتاب سید شاہ اسمعیل شہیدؒ کے ایما سے لکھی گئی ہے۔ بینی نراین بعد میں مسلمان ہو کر شاہ صاحب کے پیرو ہو گئے تھے۔

تذکرے میں کھائی ہے کہ کسی اور یقین کے شعر کو انعام اللہ خاں یقین کا لکھ دیا ہے۔
شعر یہ ہے

پڑتا ہی پاؤں اس بت کافر کے بار بار | کیا برہمن کو موہ لیا ہے دکھا کے ہاتھ

معلوم نہیں کہ یہ شعر ان کے کہاں سے ہاتھ آیا۔

بحور | یقین نے اپنے سارے دیوان میں کل ۱۳ بحریں استعمال کی ہیں اور سب کی سب شگفتہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام عام لوگوں میں بھی بہت مقبول ہوا اور بقول دی تاسی " اہلِ ہند نے ان کو حفظ کر لیا ہے اور اکثر بطور نظیر پیش کرتے ہیں " ان ۱۳ بحروں میں سے بھی تین چار بحریں یقین کو بہت ہی پسند تھیں چنانچہ اکثر غزلیں ان کی انہی بحروں میں ہیں۔ ان کی کُل ۱۷۰ غزلیں ہیں، جس میں سے ۷۱ غزلیں ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) میں، ۳۱ رمل مثمن مقصور (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات) میں، ۲۲ رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں، ۱۲ مجتث مثمن مخبون محذوف (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن) میں اور ۱۱ رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن بکسر عین) میں ہیں۔ گویا ۱۷۰ غزلوں میں سے ۱۴۷ غزلیں صرف ۵ بحروں میں ہیں اور باقی ۲۳ غزلیں ۸ بحروں میں۔

قافیے | یقین نے اپنے ہاں بہت ہی کم قافیے استعمال کئے ہیں۔ پانچ پانچ شعروں کی ۱۷۰ غزلوں میں مطلعوں کو ملا کر ۱۰۲۰ قافیے ہونے چاہیئے تھے لیکن یقین نے

کچھ کم چار سو قافیوں میں سارا دیوان ختم کر دیا ہے۔ ایک ایک قافیے کو مختلف بحروں اور مختلف ردیفوں کی غزلوں میں مختلف پہلو سے باندھا ہے۔ اس کی شاعری کا کمال ہے کہ دیوان پڑھنے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ قافیہ پہلے بندھ چکا ہے اور یہ تو دیوان بھر میں ایک جگہ بھی نہیں ہے کہ دو جگہ ایک ہی قافیہ سے ایک ہی مضمون ادا کیا ہو۔

یقین کے کلام کے متعلق رائیں

یقین کے کلام کی شہرت نے کچھ اس قدر ترقی کر لی تھی کہ باوجود خفا ہونے کے میر تقی میر کو لکھنا پڑا کہ:

"یقین شاعرِ ریختہ صاحبِ دیوان از بس کہ اشتہار دارد محتاج بہ تعریف و توصیف نیست"

دی تاسی نے معلوم نہیں کہ انعام اللہ خاں کے متعلق میر صاحب کی یہ رائے کہاں سے معلوم کی ہے۔ وہ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ:

"اس شاعر کی شہرت اگرچہ بہت ہے لیکن جتنا کہا جاتا ہے اتنا نہیں ہے"

اس کے بعد ہی پھر میر کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ:

"جو اشعار یقین کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں ان سے بہتر یا اعلیٰ اشعار ہونا دشوار ہے"

اب رہے فتح علی گردیزی تو وہ یقین کے دوست تھے انھوں نے اپنے تذکرے میں اس کو بہت سراہا ہے لکھتے ہیں:

"شہبازِ خیالش بصیدِ معنی بلند پرواز ست و ہمائے اندیشہ اش بر قلۂ قافِ سخن بہ پرفشانی ممتاز۔ بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمینِ سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سرزدہ از فرطِ شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری شدہ۔"

قیام الدین قائم یقین کو "صدر نشینِ بزم شعرائے متاخرین" کہکر لکھتے ہیں کہ:

"دو مصرع از زبان ہائے خامۂ سحر طرازش باین ہمہ لطف و خوبی می تراود کہ بمجرد استماع دلِ عشاق قطراتِ خوں شدہ از دیدہ فرو می چکد۔"

لچھمن نراین شفیق اورنگ آبادی تو یقین کے کلام کے عاشق تھے انھوں نے تو اس کی تعریف کے وہ پل باندھے ہیں کہ اس کو خدائے سخن بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"انعام اللہ خاں یقین شہنشاہ قلمرو سخندانی و یوسف کنعانِ معانی است طوطیِ شکر مقال از گلستانِ ہند برنخواستہ کہ بآں عندلیب ہزار داستان سخن بہ تشابہ گراید ... بسیارے از شکر مقالانِ متین خیال پرّہ ہم صفیری او بر داشتند آخر پشتِ دست بزمینِ نارسائی بگذاشتند (یہ میر صاحب پر چوٹ ہے کیونکہ انہی کے یہ الفاظ دہرائے ہیں) و اکثر نازک خیالانِ شیریں مقالی بمقابلہ او برخاستند آخر از قصور رگوشش مالی خود پرداختند .. ... آرے عندلیبِ گلگشت دم از عصائے ہمدمی عیسیٰ می زند و مزاجِ عالیش معانی نازک می گزیند معنی آفرینان ایں زمان از نام تضمین کلامش گرم بازاری می دارند (یہ سودا کی طرف اشارہ ہے

کیوں کہ انھوں نے یقین کے ایک مصرعہ "کیا کام کیا دل نے دیوانہ کو کیا کہئے" کو تضمین کر کے خمسہ کیا ہی) وخوش تلاشان ایں عصر از اصغاے نام نامیش دست بگوشش می گزارند ...... الحاصل یقین یکتاے عصر و یگانۂ زمانہ است وغیرہ وغیرہ"

غرض کہاں تک نقل کروں صفحے کے صفحے اسی تعریف میں بھرے پڑے ہیں۔ قدرت اللہ شوق نے نہایت مختصر اور جامع رائے دی ہی کہ :

"مشق سخن او بپایۂ استادی رسیدہ بود فاما اجلش مہلت نداد۔ ہر قدر کہ دیوانش مرتب ست ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست"

میر حسن کا بھی یہی خیال ہی کہ :

"اشعارش بسیار نمکین و موزون اند، سخن او خالی از دردمندی نیست"

یہ تو یقین کے معاصرین کی رائے ہوئی۔ بعد کے جو لوگ ہیں انھوں نے بھی اس کے کلام کے متعلق نہایت اچھے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کو "فن شعر میں کامل" (گلستان بے خزاں)۔ "تمام قسم کے اشعار میں ماہر و آگاہ کامل" (کرم الدین) "شاعر پُر درد بامزہ" (بزم سخن و سخن شعرا) اور اس کے کلام کو "مرغوب طبع اور اس کے اشعار کو جاں خراش دل و جان" (گلزار ابراہیم و گلشن ہند)۔ "متین" (تذکرۂ گلشن گفتار) "پُر نمک و باحلاوت" (گلشن بے خار) لکھا ہی۔ اور یہ تو یقیناً صحیح ہی کہ زبان کی صفائی اور اشعار میں مضمون آفرینی پہلے اس نے پیدا کی ہی۔ مصحفی کا قول ہے کہ :

"در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رُفتہ گفتہ ایں جوان ست"

دی تاسی کا بھی یہی خیال ہے وہ لکھتا ہے کہ :

" یقین کے اشعار (یا کم سے کم وہ اشعار جو اس کے کہے جاتے ہیں) بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور پڑھنے میں بڑے بامزہ ہیں ۔ ... پرانے زمانے کے ریختہ گویوں میں یقین ہی پہلا شخص ہے جو ہمیشہ اپنے خیالات کو نہایت پاکیزگی اور صفائی سے باندھتا ہے جو لوگ اس کے بعد ہوئے ہیں انھوں نے اس بارے میں اس کا تتبع کیا ہے "

مولانا عبدالحق تو اپنے تذکرۂ گلِ رعنا میں یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ :

" اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا "

یقین کی شہرت خود اس کی زندگی میں اس قدر ہو گئی تھی کہ میر و مرزا کو بھی لوگ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے کی ایک رباعی ہے ؎

جس طرح سے لاتے ہیں مضامینِ متین … اشعار میں ریختہ کے سودا و یقین
ایسا کوئی نہیں ہند میں ہر چند کہ ہیں … سجّاد[1] و کلیم و میر و درد و تمکین[2]

---

[1] میر محمد سجّاد۔ اکبرآباد کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں آکر رہے۔ آبرو کے شاگرد ہوئے۔ ان کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ میر تقی میر ان سے بھی بگڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کلام بہت شیریں اور دلفریب ہے۔ اپنے زمانہ میں بڑے پایہ کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ [2] میاں صلاح الدین تمکین دہلی کے رہنے والے اور حاتم کے ہمعصر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اور نہایت شوخ طبع آدمی تھے۔ ان سے بھی میر تقی میر بہت ناراض ہیں۔ فرماتے ہیں جوانے بے تمکینے نہ تمکین۔ با صطلاح یارانِ شوخ طبع مردیست "۔ صرف یقین ہی پر میر صاحب کی نظرِ عنایت نہ تھی بلکہ اس زمانہ میں جو شاعر ان کے مقابل میں آیا۔ انھوں نے اپنے تذکرہ میں اس کی مذمت کر دی ۔

لچھمن نراین شفیق کچھ اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور اس رباعی پر حاشیہ چڑھاتے ہیں ؎

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا ۔۔۔ کرے جو فکر تتبع یقین کا از دل و جاں
کہیگا معنی باریک و خوب شیریں تر ۔۔۔ و لے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں

ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ اگر میر صاحب نے یہ کہا کہ ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا ۔۔۔ مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تو یقین نے اس کے مقابلے میں خم ٹھونک کر یہ جواب دیا کہ ؎

یقیں تائیدِ حق سے شعر کے میداں کا رستم ہے ۔۔۔ مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت

یقین کے دیوان کا مقابلہ اس زمانہ کے دوسرے شاعروں سے کرنے کے بعد یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شاعر بھی اس کی طرز کی پیروی کرتے تھے۔ اس کی بحریں ایسی شگفتہ، اس کے قافیے اور ردیفیں ایسی مرغوب طبع اور اس کے الفاظ ایسے سیدھے سادے اور موثر ہوتے تھے کہ عام تو عام خواص پر بھی اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔" اس کا کلام لوگ حفظ کر لیتے اور بطور نظیر پیش کیا کرتے تھے۔" (دی تاسی)

بھلا لوگ یقین کی نقل کریں اور یقین خاموش رہیں۔ ایک ساتھ سب پر چوٹ کی ہے اور خوب کی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

حق کو یقیں کے یاروں بر باد مت دو آخر ۔۔۔ تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں

اس زمانے میں شاہ حاتم جگت استاد تھے۔ انھوں نے بلا تامل اپنی پیروی طرز یقین کو نہ صرف تسلیم کر لیا بلکہ اپنے دیوان میں بھی اس کا اظہار کر دیا۔ حاتم نے جو غزلیں یقین کی طرز پر لکھی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

نمبر شمار[۱]	مصرعہ اول مطلع غزل حاتم	غزل کہنے کا سنہ
۱	ہماری سیر کو گلشن سے کوئے یار بہتر تھا	۱۱۶۰ھ
۲	جی دیا حاتم نے کیا بے وقت و بے جا بے طرح	۱۱۵۵ھ
۳	ہو رہا ہے ابر اور کرتا ہے وہ جانانہ رقص	۱۱۵۸ھ
۴	دیکھ کر بلبل لب و رخسارِ خوباں کی طرف	۱۱۵۷ھ
۵	سینہ نالاں کا حریف اور چشم گریاں کا حریف	۱۱۶۱ھ
۶	دل میں یوں ہے تجھ خیالِ چشم کے آنے میں دھوم	۱۱۵۳ھ
۷	جب سے تمھاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں	۱۱۵۶ھ
۸	خدا کے واسطے کوئی میری فریاد کو پہنچے	۱۱۵۲ھ

اس زمانے میں دہلی تو شاعروں سے بھری پڑی تھی، البتہ شاہ حاتم کے علاوہ صرف چار شاعروں یعنی میر، سودا، درد اور تاباں پر لوگوں کی خاص طور پر نظر پڑتی

---

[۱] یہ فہرست مجھے سید محی الدین صاحب قادری۔ پی۔ ایچ۔ ڈی سے ملی ہے۔ جو انھوں نے حاتم کا اصلی دیوان دیکھ کر برٹش میوزیم لندن میں مرتب کی تھی۔ میں ان کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں۔ ان غزلوں کے بعض اشعار حاتم کے "دیوان زادہ" میں بھی موجود ہیں۔

تھی۔ ان چاروں کے دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی بہت سی غزلیں یقینؔ کی طرز پر ہیں لیکن یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ابتدا میں اس طرز پر کس نے غزل لکھی۔ اگر یقینؔ کے دعوے کو (تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں) تسلیم کیا جائے تو ان طرزوں کا موجد یقینؔ ہی کو مانا جائے گا۔ ان غزلوں کا ایک ایک مصرعہ دیدیتا ہوں، تاکہ یقینؔ کے کلام کے ساتھ ان کو پڑھنے میں لطف آسکے۔

میر کی غزلیں

مصرعہ

۱۔ سب پہ روشن ہے کہ شب محلس میں جب آتی ہے شمع
۲۔ آگ سا تو جو ہوا اے گلِ تر آن کے بیچ
۳۔ دورِ گردوں سے ہوئی کچھ اور میخانے کی طرح
۴۔ چمکنا برق کا کرتا ہے کارِ تیغ ہجراں میں
۵۔ بہار آئی مزاجوں کی سبھی تدبیر کرتے ہیں
۶۔ رونے کو کوئی آہوں سے یوں کب تک ہوا دیوے
۷۔ بہار آئی نکالو مت مجھے اب کے گلستاں سے
۸۔ کہو میرؔ کی وحشت سے ان گلیوں میں آنے کی

سودا کی غزلیں

۱۔ شمع میں ہر چند ہے سر سے گزر جانے کی طرح

۲- کس کے ہیں زیرِ زمیں دیدۂ نمناک ہنوز

۳- کیا مچائی اس نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم

۴- ہے زلف میں دل میرا مت کیجیو تو شانہ

۵- تمیزِ خوب و زشت اے مہرباں کب عشق نے پائی

۶- نہیں ممکن اسیروں کی کوئی فریاد کو پہنچے

درد کی غزلیں

۱- کھلا دروازہ میرے دل پہ ازبس اور عالم کا

۲- گر خاک میری سرمۂ ابصار نہ ہووے

تاباں کی غزلیں

۱- صبح آغوش میں تھا مہرِ درخشاں میرا

۲- کس سے پوچھوں ہائے میں اس دل کے سمجھانے کی طرح

۳- صرف ہی چاک کلالوں میں میری خاک ہنوز

۴- یاں تلک کی ہے ترے ہجر میں فریاد کہ بس

۵- کر نظر تیرے خط و زلف پریشاں کی طرف

۶- آئی خزاں چمن سے گئی اب بہار حیف

۷- نہ کرتی تو معیّن اس چمن میں کاش جا بلبل

۸- سُن فصلِ گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں

۹۔ جی کا دینا میرے نزدیک تو کچھ دُور نہیں

۱۰۔ اے شمع رو مرے گا جو کوئی تیری لگن ہیں

۱۱۔ گئے نالے ترے برباد مانندِ جرس چپ رہ

۱۲۔ نہیں دیتا ہے وہ ظالم کسی کی داد کیا کیجے

۱۳۔ میرے دل کی سی اے یاروں جرس فریاد کیا جانے

میں نے ان شعرا کی صرف ان غزلوں کا حوالہ دیا ہے جن کے اشعار کے قافیے یقین کی غزلوں کے قافیوں سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حاتم، میر سودا، درد اور تاباں کی بعض غزلیں ہیں جن کی زمین وہی ہے جو یقین کی غزلوں کی ہے لیکن چوں کہ ان میں ایسے قافیے باندھے گئے ہیں جو یقین کے ہاں نہیں آئے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کا حوالہ دینا بے ضرورت سمجھا۔

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کے پاس ان شعرا کے دیوان نہ ہوں اور وہ غزلوں کے مقابلہ کا لطف نہ اُٹھا سکیں اس لئے میں ان پانچوں شاعروں کی ایک ایک غزل یقین کی غزل کے ساتھ یہاں نقل کئے دیتا ہوں اور غزلیں وہی لیتا ہوں جن کے اکثر اشعار ہم قافیہ ہیں:

شاہ حاتم	یقین
(۱) دل میں یوں ہے تجھ خیالِ چشم کے آنے میں دھوم مچ رہی ہو جس طرح مستوں سی میخانے میں دھوم	(۱) پڑ گئی دل میں ترے تشریف فرمانے میں دھوم باغ میں مچتی ہے جیسے فصلِ گل آنے میں دھوم

(۲) تم نہ بولو۔ گو کہ عاشق آپ کو ضائع کریں
جانِ من ہو گی تمھارے مُنہ سے فرمانے میں دھوم

(۳) ایک تو فتنہ اُٹھاوے ہے تیری خوؤں کی بو
تس اوپر ہو گی قیامت عطر ملوانے میں دھوم

(۴) گل گریباں چاک اور غنچے ہوئے ہیں غرقِ خوں
کیا بلا ڈالی ہے تم نے جان پاں کھانے میں دھوم

(۵) اس کی ہمت سے تو جی دینا تجھ اوپر دور نہیں
ہو دیگی ہر شہر میں حاتم کے مرجانے میں دھوم

(۲) تیری آنکھوں نے نشہ میں اس طرح مارا ہے جوش
ڈالتے ہیں جس طرح بدمست میخانے میں دھوم

(۳) چاند کے پرتو سے جوں پانی میں ہو جلوہ کا حشر
مُنھ ترے کے عکس نے ڈالی ہے پیمانے میں دھوم

(۴) ابر جیسے مست کو شورش میں لاوے دل کی پیچ
مچ گئی ایکبار ان بالوں کے کھل جانے میں دھوم

(۵) بوئے مے آتی ہے مُنہ سے جوں کلی سے بوئے گل
کیوں یقیں سے جان کرتے ہو کر جانے میں دھوم

میر تقی میر

(۱) اس کے ہوتے بزم میں فانوس میں آتی ہے شمع
یعنی اس آتش کے پروانے سے شرماتی ہے شمع

(۲) ہر زماں جاتی ہے گھٹتی سامنے تیرے کھڑی
جوشِ غم سے آپ ہی اپنے تئیں کھاتی ہے شمع

(۳) بیٹھے اس مہ کے کسی کو دیکھتا ہے کب کوئی
رنگ رو کو بزم میں ہر چند چمکاتی ہے شمع

یقین

(۱) رشک تیری دلربائی کا زبس کھاتی ہے شمع
دیکھ تیرے حُسن کے شعلہ کو جلجاتی ہے شمع

(۲) عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال
کس قدر پہلوئے چرب اپنے سے دکھ پاتی ہے شمع

(۳) بے حجابی بسکہ شانِ حُسن کے لائق نہیں
بزم میں فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع

(۴) باد سے جنبش میں کچھ رہتا نہیں ہے متصل
اس بھبھوکے سے جو کہتی ہے سو جھنجلاتی ہے شمع

(۵) چھوڑتی ہے لطف کیا افسردگی خاطر کی میر
آگے اس کے چہرۂ روشن کے بجھ جاتی ہے شمع

(۴) اہلِ سوز آہن دلوں سے بسکہ شرماتے ہیں سخت
دیکھکر گلگیر کی صورت کو کٹ جاتی ہے شمع

(۵) باد سے برہم نہیں ہوتا ہے یہ شعلہ یقیں
بلکہ پروانہ کی گستاخی سے جھنجلاتی ہے شمع

سودا

(۱) ہے زلف میں دل میرا مت کیجیو تو شانہ
زنجیر نہ کھل جائے۔ ہے سخت یہ دیوانہ

(۲) میں تجھ سے یہ کہتا تھا مت گھر سے تو نکلا کر
اب شورِ قیامت نے گھیرا ہے درِ خانہ

(۳) اے آتشِ گل تو ہی کر خس کو مرے اپنا
ہر چند میں گلشن میں ہوں سبزۂ بیگانہ

(۴) کعبہ کی زیارت کو اے شیخ میں پہنچونگا
مستی سے مجھے بھولی جس دن رہِ میخانہ

(۵) تنہا نہ ہمارا ہی مضحک ہے تو اے زاہد
گیدی تیری داڑھی پر ہنستا ہے سدا شانہ

(۶) در خلق کے میں منہ پر باندھا ہی حباب آسا
تا دم ہے نہ کھولونگا ہرگز رہِ کاشانہ

یقین

(۱) زاہد جو نہ ہم ہوتے یہ دیر تھا ویرانہ
ہے شور سے مستوں کے آباد یہ میخانہ

(۲) منھ اپنے کے گلشن میں رہنے نہ دیا کر تو
یہ سبزہ ترے خط کا ہے سبزۂ بیگانہ

(۳) ہوں دور پہ جی میرا توں کو ترے گھر پہ
پھرتا ہے پڑا۔ جیسے فانوس پہ پروانہ

(۴) مجنوں نے جو یہ دھومیں دور ہی میں مچائی ہیں
ہے نشہ تو آجائے یہ دشت یہ ویرانہ

(۵) روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
کچھ خوب نہیں سننا۔ افسوں ہے یہ افسانہ

(۷)- ہر چند کہ سب عاشق مضبوط جوانی ہیں
اُڑتا ہی دھواں جیسے سودا سو ہی پروانہ

درد

۱- کھلا دروازہ میرے دل پہ ازبس اور عالم کا
نہ اندیشہ ہی شادی کا مجھے نے فکر ہی غم کا

۲- بلند و پست سب ہموار ہیں اپنی نگاہوں میں
برابر ساز میں ہوتا ہی جوں سر زیر اور بم کا

۳- گلستانِ جہاں کی دید کیجیو چشم عبرت سے
کہ ہر ایک سرو قد ہی اس چمن میں نخل ماتم کا

۴- چمن میں باغباں ہی صبح کو کہتی تھی یہ بلبل
گلوں کے منہہ پہ یوں چڑھتی ہی دیدہ شبنم کا

۵- نہیں مذکور شاہاں درد ہرگز اپنی محفل میں
کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

یقین

۱- نہ ہو جیو دور میرے سر سے ظلِّ عاطفت غم کا
نہ پڑیو داغ پر میرے الٰہی سایہ مرہم کا

۲- خداوندی کی چاہی ہی خلافت حق تعالیٰ نے
کوئی مطلب نہیں پایا ہی یہاں آنے سے آدم کا

۳- ارے واعظ ہمارے پاس ہی آتش محبت کی
کہ جس کو دیکھ زہرہ آب ہو جاوے جہنم کا

۴- سبھی مرتے ہیں خوشوقتی پہ جی دیتے ہیں شادی پہ
تکلف برطرف یہ نوحہ گر بندہ ہی ماتم کا

۵- شکوہ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں
یقین سورج کے آگے کب اثر رہتا ہی شبنم کا

تاباں

۱- میرے جی کی سی اے یاروں جرس فریاد کیا جانے
تڑپ بھی اس طرح کی کشتۂ جلاد کیا جانے

یقیں

۱- ہمیں ہجر چمن ہی موت پہ صیاد کیا جانے
جو گزرے سر پہ مقتولوں کو وہ جلاد کیا جانے

۲- تری زلفوں کو دل لینے کے لاکھوں پیچ آتے ہیں
یہ تکلیں صید کرنے کی کوئی صیاد کیا جانے

۳- نگہ آئینہ دل میں تیری جوں ڈوب جاتی ہے
لگانا اس صفا سے نشترِ فصاد کیا جانے

۴- وہ گردن سر کریں میری ہووں کے ایک اشارہ سے
یہ جلدی درا ایسا کب کوئی جلاد کیا جانے

۵- یقیں ہے میرے تئیں تاباں کہ جمع نونہالاں سے
یہ اٹکھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے

۲- دوانہ ہوں میں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا
مزے لے لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے

۳- ہمیں کانٹا قفس کا شاخِ گل ساجی میں چبھتا ہے
اسیری کے مزے کو بلبلِ آزاد کیا جانے

۴- گلا تو پھٹ گیا سنے کی طرح فریاد سے میرا
قیامت دور ہے کس دن ملے گی داد کیا جانے

۵- درختوں سے دے تشبیہ اس قد کو یقیں ہرگز
یہ اٹکھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے

تاباں نے مقطع میں یقیںؔ کے مصرع کی تضمین کی ہے اور پہلے مصرع میں "یقین" کا لفظ لا کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ سودا نے بھی یقیںؔ کے ایک مصرع کو تضمین کر کے خمسہ کر دیا ہے۔ آخری بند نقل کرتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا اس مصرع کو پڑھتے ہیں اور مزے لے رہے ہیں ؎

مصرع کو یقیں تیرے سودا نے سنا تھا کل — روتا ہے وہ یوں تب سے ہے گویا بادل
ہے رعد نمط نالاں بجلی کی طرح بے کل — پڑھتا ہے یہی پھر پھر آنکھوں کے تئیں مل مل
کیا کام کیا دل نے دیوانہ کو کیا کہیے

تو ہاں میں نے یہ غزلیں تو لکھدی ہیں لیکن یہ ڈر ہے کہ کہیں کوئی صاحب

یہ اعتراض نہ کر بیٹھیں کہ یقین کی تائید میں اس کی تو اچھی اچھی غزلیں لے لیں اور دوسروں کی بُری۔ اس کے متعلق میں انتخاب کا اصول پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ میں وہ غزلیں لوں گا جن میں ہم قافیہ اشعار زیادہ ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان استادوں نے ایک ہی قافیہ کو کیسا چمکایا ہے۔ علاوہ ازیں میں اس بحث کی ابتدا میں ان شعرا کی اُن غزلوں کے مطلع دے آیا ہوں جن کا جواب یقین کے ہاں موجود ہے۔ آپ خود مقابلہ کر لیجئے۔ معلوم ہو جائے گا کہ یقین کسی غزل میں بھی ان میں سے کسی استاد سے دب کر نہیں رہا ہے۔

یہ تو دنگل کا مقابلہ تھا۔ اب دیکھئے اپنے ہی اکھاڑہ کا کیا رنگ ہے۔ مرزا مظہر کے شاگردوں میں یقین کے علاوہ چند ایسے لوگ تھے جو صاحبِ دیوان ہوئے جنہوں نے استاد کے نام کو چمکایا اور جو آسمانِ شاعری کے روشن تارے مانے جاتے تھے ان میں احسن اللہ خاں بیان سب سے پیش پیش ہیں۔ یقین کی غزل پر غزل لکھتے ہیں مگر اکثر قافیہ بچا جاتے ہیں۔ ان دونوں کی بھی غزلیں بالمقابل ملاحظہ ہوں۔ زمین و آسمان کا فرق ہے:

بیان	یقین
۱۔ آتا ہے مجھکو دیکھ کے جوشِ بہار حیف	۱۔ ناصح سے مجھکو غم نے کیا شرمسار حیف
اے عندلیب تو ہے قفس میں ہزار حیف	سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

۲- یہاں تک ہوں خستہ حال کہ دیکھے ہی جو مجھے
نکلے ہی اس کے منہ ستی بے اختیار حیف

۳- میں بسکہ خاک ہیں تیرے کوچہ کی مل گیا
تس پر بھی تیرے دل میں ہی مجھ سے غبار حیف

۴- بسمل ہی کر کے چھوڑ دیا پھر نہ لی خبر
فتراک سے تیرے نہ بندھا یہ شکار حیف

۵- کیا کیا شرار کے واسطے میں نے کئے قبول
سمجھا نہ خیر خواہ بیاں مجھکو یار حیف

۲- رو دیا ہوں یہاں تک کہ اب آنکھوں میں نم نہیں
بے آب ہو گئے گہر آبدار حیف

۳- کوئی بلبل ان دنوں میں نہ پھنسیو خیابچہ میں
جب تک کہ چھوٹوں ہو گئی آخر بہار حیف

۴- اس دکھ میں دیکھ مرگ بھی مجھ سے سرک گئی
کیا غم نے کر دیا مجھے زار و نزار حیف

۵- جاتی نہیں وہ بے مزگی ہجر کی یقین
کچھ وصل کے نشہ نے نہ کھویا خمار حیف

مرزا مظہر کے دوسرے مشہور شاگرد میر محمد باقر حزیں ہیں۔ یہ بھی صاحب دیوان ہیں اور انھوں نے بھی یقین کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ ایک غزل مقابلہ کے لئے لکھتا ہوں ؎

حزیں

۱- جو ہیں آنکھوں کے مخموران کو میخانے سی کیا نسبت
نگہ کے ہیں جو تشنہ ان کو پیمانے سی کیا نسبت

۲- یہ آہو رام تھے مجنوں کے سبب لیلےٰ کی خاطر
وگرنہ ان پریزادوں کو دیوانے سی کیا نسبت

یقین

۱- تیری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سی کیا نسبت
نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سی کیا نسبت

۲- یہ جیوے ہجر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا
تکلف بر طرف بلبل کو پروانے سی کیا نسبت

۳- خبر لے یا نہ لے صیاد ان کو دام میں مرنا
گرفتاروں کو تیرے آب و دانے سے کیا نسبت

۴- ہوا ہے تو حزیں دیوانہ ان شہری غزالوں کا
تجھے صحرا سے اب کیا کام ویرانے سے کیا نسبت

۳- یہ وہ موتی ہیں جن کی سیپیاں آنکھیں ہیں عاشق کی
میرے آنسو کو مروارید کے دانے سے کیا نسبت

۴- ارے دل مت توقع دلبروں سے رکھ ترحم کا
لہو پیتے ہیں جو شخص ان کو غم کھانے سے کیا نسبت

۵- گل اس کا داغ ہے اور سرو اس کا آہ موزوں ہے
یقیں سے نوحہ گر کو باغ میں جانے سے کیا نسبت

مرزا مظہر کے تیسرے مشہور شاگرد محمد فقیہ دردمند ہیں۔ وہ مثنوی کے استاد ہیں۔ ہاں ان کی ایک رباعی آردو کی ایسی ہے کہ یقین کے ایک شعر سے بہت ملتی جلتی ہے۔ لیکن یقین جو دو مصرعوں میں کہہ گیا۔ وہ ان سے پوری ایک رباعی میں ادا نہ ہو سکا۔ ایسی ہی باتوں سے شاعر کی استادی معلوم ہوتی ہے۔

دردمند کی رباعی

کہسار میں جا رہا ہے ناحق کے تئیں ۔۔۔ پہ دیر سے آ بھڑا ہے ناحق کے تئیں
کوئی ٹکر پہاڑ سے لیتا ہے ۔۔۔ فرہاد کا سر پھرا ہے ناحق کے تئیں

یقین کا شعر

خسرو کے منہ پہ چڑھنا اور بیستوں سے بھڑنا
کچھ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

دیکھئے مضمون ایک ہی ہے مگر جو طریقۂ ادا اور شوخی یقین کے ہاں ہے وہ درد مند کے ہاں نہیں۔

اس زمانہ میں ایہام گوئی پر شاعری کا دار و مدار تھا۔ یقین ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے شاعری کو ان الجھنوں سے نکالا۔ اور زبان کی صفائی اور مضمون کی پاکیزگی پر شاعری کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ مصحفی نے لکھا ہے کہ:

"در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود۔ بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ۔"

خود ان کو بھی ایہام گوئی سے نفرت تھی۔ لکھتے ہیں ؎

شاعری ہے لفظ و معنی سے تری لیکن یقیں
کون سمجھے یہاں تو ہے ایہام مضموں کا تلاش

انقلاب ہمیشہ ایک شخص سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد دوسرے اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ تحریک زور پکڑ جاتی ہے۔ یقین کے بعد دوسرے بڑے شعرا نے بھی ایہام گوئی ترک کرنی شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ صنعت دہلی کی شاعری سے مفقود ہو گئی۔ غدر سے کچھ پہلے رعایتِ لفظی کا کچھ اثر لکھنؤ سے دہلی پر پڑا تھا۔ مگر وہ تھوڑے ہی دنوں میں زائل ہو گیا۔ اور دہلی کی شاعری نے وہی رنگ اختیار کر لیا جو یقین اور اس کے معاصرین نے ڈالا تھا۔ پہلے زمانہ میں یقین کے جتنے تتبع کرنے والے تھے اتنے شاید ہی کسی شاعر کو

نصیب ہوئے ہوں گے۔ بعضوں کا تو یہ حال تھا کہ اس کی غزل پر غزل کہنا باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اس کے دیوان کے مطالعہ کو اپنی زبان کی اصلاح کا ذریعہ جانتے تھے۔ ان سب میں لچھمن نراین شفیق سب سے پیش پیش ہیں۔ ان کا حال میں پہلے لکھ آیا ہوں۔ یہ لکھتے ہیں ؎

ہم کو دیوانِ یقیں کی سیر ہے صاحب سدا
بلبلوں سے چھوٹتا کب ہے گلستاں کا خیال

دیوانِ یقیں خوش خط صاحب نے لکھایا ہے
اوراقِ طلائی پر کھینچی گئیں تحریریں

چوں کہ شفیق کی خاص حالت ہے کہ انھوں نے یقین کی ہر غزل پر غزل لکھی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کی ایک ایک غزل نمونے کے طور پر بالمقابل یہاں نقل کر دی جائے۔

یقین	صاحب
۱۔ کون کر سکتا ہے اس خلّاقِ اکبر کی ثنا	۱۔ کیوں کہ ہو مخلوق سے خلّاقِ اکبر کی ثنا
نارسا ہے شان میں جس کے پیمبر کی ثنا	بت کتنیں طاقت کہوے جو بت گر کی ثنا
۲۔ سربراہ اس منھ سے ہو سکتی ہے کب نعتِ رسولؐ	۲۔ حمد میں خلّاق کے جس طور میں معذور ہوں
یا ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ کی ثنا	ویسے ہی ہوتی نہیں مجھ سے پیمبرؐ کی ثنا
۳۔ یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے جو کیجیے	۳۔ جو کوئی صدق و عدالت اور حیا و علم کے
حضرتِ زہراؓ کی اور شبیرؓ و شبّرؓ کی ثنا	باب ہیں ان کی ثنا ویسے ہی مظہر کی ثنا

۴- کوثر و تسنیم سے اپنا دہن دھولوں تو ہو
حضرتِ خیر النسا اور دونوں سرور کی ثنا

۵- پر توِ آزاد سے صاحب میں نورانی ہوا
فرض ہی میرے پہ دل سے مہرِ انور کی ثنا

۴- نام حمد اور مدح کا لینا مجھے انصاف نہیں
کی ہی ساری عمر ترکانِ ستمگر کی ثنا

۵- جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقین
حضرتِ استاد یعنی شاہِ مظہر کی ثنا

خیر شفیق اور یقین کے کلام میں تو زمین و آسمان کا فرق ہی- آج کوئی صاحب
اس زمین میں ایسے چھوٹے چھوٹے اور سیدھے سادھے الفاظ میں ایسی حمد نعت
اور مدح لکھدیں تو جانوں۔

یقین کے کلام کے تتبع کا شوق تمام ہندوستان میں آگ کی طرح پھیلا ہوا
تھا۔ یہ شوق صرف شمالی ہند ہی تک محدود نہ تھا۔ دکن میں بھی اس کے بہت
پیرو تھے۔ اسی پیروی کی وجہ سے بعض تذکرہ نویسوں نے شیر سنگھ ظہور[1] سیتارام
عمدہ[2] اور عبد الولی عزلت[3] کو یقین کا شاگرد لکھدیا ہی۔

---

[1] شیر سنگھ ظہور۔ ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔ [2] سیتارام عمدہ۔ یہ ذات کے کشمیری تھے کشمیر ہی میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے اپنے بھائی راجہ دیارام پنڈت کے ساتھ دہلی میں آ گئے۔ عمر میں یقین سے بہت بڑے اور سراج الدین خاں آرزو کے ہمعصر تھے یقین کے کلام سے ایسے متاثر ہوئے کہ اس کا تتبع اختیار کیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو یقین کا شاگرد بھی لکھا ہی ۱۲ [3] میر عبد الولی عزلت ابن میر سعد اللہ۔ سورت کے رہنے والے تھے بعض تذکروں میں لکھا ہی کہ لکھنؤ کی نواح کے باشندہ تھے۔ یہ خاندان بزرگی، علم و فراست میں بڑا مشہور تھا اور

(بقیہ نوٹ بر صفحہ آیندہ)

یقین کی زبان (۱) یہ وہ زمانہ تھا کہ اُردو زبان بن رہی تھی اور اس کو اس قابل کیا جا رہا تھا کہ شاعری میں خیالات کا پوری پوری طرح اظہار کر سکے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے فارسی پر نظر پڑی۔ اسی زبان کے محاوروں کو اُردو کا لباس پہنایا گیا۔ اور آخر یہ زبان پر استعمال ہوتے ہوتے ایسے رواں ہو گئے کہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ فارسی سے لئے گئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کرتا ہوں۔

ناصح جو یہ نصیحتِ بے جا نہ میں سنی مَعذور رکھیو مجھکو میرا دل بجا نہ تھا

معذور داشتن اور بجا نہ ماندن کا ترجمہ ہے۔

مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی دیکھا تو زندگی میں مزا کچھ رہا نہ تھا

طرح اختیار کردن یا طرح انداختن کا ترجمہ ہے۔

لذّتیں ساری گرفتاری کی جاتی ہیں بباد جب قفس میں یاد آتی ہے گلستاں کی ہوا

بباد رفتن سے یہ محاورہ اُردو میں آیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) شہنشاہ اورنگ زیب کو ان لوگوں پر بڑا بھروسا تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد عزلت دہلی آئے یہاں ان کو اہلِ علم کی صحبت ملی اور یہیں ریختہ گوئی کا ان کو شوق ہوا۔ بعد میں دہلی سے یہ مرشد آباد گئے اور نواب الہ وردی خاں کے مصاحب ہو گئے۔ نواب کے انتقال کے بعد اُنھوں نے دکن کا رخ کیا۔ حیدر آباد میں قیام کیا اور یہیں پیوندِ زمین ہوئے۔ ہندی کے دوہرے اور کبت کہنے میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ ہندی میں نرگس تخلص کرتے تھے۔ تاریخ انتقال کا پتا نہیں چلا البتہ ۱۱۷۵ھ تک زندہ تھے ۱۲

آئینہ سے بھی گیا۔ کیا دلِ حیراں میرا
رُو اگر دیجئے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں

رُو دادن سے یہ محاورہ لیا گیا تھا لیکن چلا نہیں۔ ترک کر دیا گیا۔

کیا غلط کرتے ہیں میرے چشمِ بینا بے طرح
خوب رُو حق میں میرے بد خو نکل جاتے ہیں آہ

غلط کردن کا ترجمہ ہے۔ اب صورت بدل گئی۔ غلط کرنے کی بجائے غلطی کرنا بولتے ہیں۔

باغباں کا حکم یوں ہے۔ لے گلستاں الوداع
نہیں ہمیں فرصت کہ اب کے سال باندھیں آشیاں

آشیاں بستن اپنی اصلی شکل میں اردو میں آیا تھا۔ اب آشیاں بنانا بولتے ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی اصلی شکل میں حیدر آباد میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مکان بنانے کو مکان باندھنا کہتے ہیں۔

متروکات (۲) تعجب ہوتا ہے کہ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ یقینؔ کے بہت عرصہ بعد تک زندہ رہے اور اس زمانہ تک اردو نے بہت کچھ ترقی کر لی تھی۔ بہت سے الفاظ ترک ہو گئے تھے اور ان کی بجائے نئے الفاظ داخل ہو چلے تھے۔ لیکن الفاظ متروک یقینؔ کے ہاں اس قدر کم آئے ہیں کہ اس زمانہ کے شاید ہی کسی شاعر کے ہاں آئے ہونگے۔ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور آئے بھی ہیں تو ایک ایک دو شعروں میں آئے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی ترک شدہ لفظ موجود ہو۔ ان کے ہاں جیونا بجائے جینا۔ کیدھر بجائے کدھر۔ بوجھنا بجائے جاننا۔ جاگہہ بجائے جگہ۔ تمام دیوان میں ایک ایک جگہ اور ایدھر بجائے ادھر۔ سیتی اور سیتی

بمعنی سے دو دو جگہ آیا ہے اور بس ہوا بجائے مرنا کے بھی دو جگہ استعمال کیا ہے لیکن مجھے اس لفظ کو متروک کہنے میں ذرا تامل ہے۔ اس کے معنی "مرنے" سے کچھ مختلف ہیں۔ جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں "مرنے" کا لفظ رکھکر دیکھ لو۔ لطف جاتا رہتا ہے۔

تعقید یں (۳) معلوم نہیں کہ کیوں شعرائے قدیم تعقید کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ بولنے میں تو تعقید ایسی بُری نہیں معلوم ہوتی ہاں تحریر میں بڑی کھٹکتی ہے۔ چوں کہ اس زمانہ میں یہ کوئی عیب نہ تھا۔ اس لئے یقین نے بھی اس کو جائز سمجھکر استعمال کیا ہے پھر بھی اس کی کمی ظاہر کر رہی ہے کہ جہاں تک ممکن تھا اُنھوں نے اس سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ جو دو چار بہت بُری تعقید یں سارے دیوان میں آئی ہیں ان کو یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ تعقید معنوی دیوان بھر میں صرف ایک جگہ آئی ہے:

اب جوں سرِ شک خاک سے سکتا نہیں ہوں اُٹھ — آ گے ہیں دل کی آنکھ سے ایسا گرا نہ تھا
گو رہیں جاوے گا خمخانہ کی حسرت لے یقین — لے گیا جمشید جوں عالم سے گنجینے کا داغ
ہوا دیوانگی میری کا وہ گل پیرہن باعث — کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کو سیرِ چمن باعث

مگر یہ سب تعقید یں ایسی ہیں کہ اب بھی بہت کم شعرا ان سے اجتناب کرتے ہیں۔ کوئی سا دیوان بھی اٹھا کر دیکھ لیجئے یہ کمزوری عالمگیر پایئے گا

تذکیر و تانیث (۴) یقین کے کلام میں اکثر الفاظ ایسے ہیں جو اب مذکر سے مونث اور مونث سے مذکر ہو گئے ہیں۔ یقین نے ہر جگہ بلبل کو مونث باندھا ہے لیکن صرف

اس شعر میں مذکر کر دیا ہے

یقیں، بلبل کہاں ہوتا ہے پیدا اس سلیقہ کا   کیا ہے منتخب خوباں کے منھ کا گلستاں تو نے

یہاں یہ لفظ مونث بھی آسکتا ہے۔ مگر جس قدر نسخے میں نے یقین کے دیوان کے دیکھے ان سب میں یہاں بلبل مذکر آیا ہے۔ چوں کہ بلبل کو خود اپنے سے تشبیہ دی ہے اس لئے شاید اس لفظ کو یہاں مذکر کر دیا ہے۔ لفظ سیر اس زمانہ میں مذکر تھا

ہوا دیوانگی میرے کا وہ گل پیرہن باعث   کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کا سیر چمن باعث

میر صاحب نے بھی اس لفظ کو مذکر باندھا ہے

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یہاں   نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

اسی طرح مرگ کو بھی مذکر باندھا ہے

محبت کا نہیں ہے ظلم بھی خالی عدالت سے   ہوا پرویز کے جینے کا مرگ کوہکن باعث

لفظ تلاش بھی اس زمانہ میں مذکر تھا

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش   روز و شب لیلی کو تھا درپیش مجنوں کا تلاش

قافیہ (۵) پہلے زمانہ میں (ر) اور (ڑ) کا قافیہ جائز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ شاہ حاتم نے بھی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"سر کو دھڑ کا قافیہ باندھا جاتا تھا۔ مگر میں نے اس کو ترک کر دیا"

یقین نے بھی ایک آدھ جگہ اس کا استعمال کیا ہے۔ قافیہ مع ردیف زور اور شور تھا۔ اس غزل میں دو شعر لکھے ہیں

عشق کے آئین میں صورت کیونکہ بچھڑے ان کا دین
جو کہ جاتے ہیں طرف کعبہ کی بت خانے کو چھوڑ

خدمتوں میں بھی تجارت سے ہے زیادہ منفعت
رشوتوں میں تب تو لاکھوں دے کے لیتے ہیں کروڑ

آخر شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں رشوت کا بڑا زور تھا۔ سودا کے ہاں بھی کئی جگہ ر کا قافیہ ڑ بندھا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

ساقِ سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

رعایت لفظی (۶) یقین کے کلام میں رعایتِ لفظی ضرور ہے مگر جیسے آٹے میں نمک۔ بعض جگہ یہ رعایت بے لطف ہوگئی ہے ؎

مجھے دکھ پھر دیا تو نے منڈا کر سبزۂ خط کو
جراحت کو میری وہ مرہم زنگار بہتر تھا

جلتے بلتے سے نہ مل ان تیلیاں کپڑوں کے ساتھ
جی دھڑکتا ہے مبادا لگ اٹھے دامن کو آگ

کر دیا آنکھوں کے رونے نے میرے دل کو خنک
کب تلک گرمی کروں اس مردمِ آبی کے ساتھ

منفعل ہوں سخت جانی سے میں اپنی مجھ بہ حیف
جس قدر تو سنگ دل ہے اتنی مینائی نہیں

عجیب و غریب ترکیبیں (۷) لفظ مینائی کی ترکیب قابل غور ہے۔ اسی لفظ کو ایک دوسری جگہ لائے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شکن مشتاق دل کی ترکیب کو بھی دیکھنا چاہیئے۔

شکن مشتاق دل میرا ہوا ہے سخت سودائی
جہاں یہ دیکھتا ہے سنگ واں کرتا ہے مینائی

شعر کے یہ معنی ہوئے کہ میرے دل کو ٹوٹنے کا ایسا شوق ہے کہ جہاں پتھر دیکھا ہے وہاں شیشہ بن جاتا ہے۔

نہیں ہوتی کسی احباب کی خاطر ملول اس سے ‌ ‌ ‌ ‌ خدا شاہد عجب بے بد مصاحب ہے یہ تنہائی

شاعر کہتا ہے کہ واللہ تنہائی ایسی اچھی مصاحب ہے کہ اس سے کسی دوست کے دل پر غبار نہیں آتا۔ ورنہ مصاحب تو اس بلا کی لگائی بجھائی کرتے ہیں کہ بڑے بڑے دوستوں کا دل ایک دوسرے سے پھیر دیتے ہیں۔

کہاں سکتے ہیں چڑھ منھ پر بتانِ ناز و تمکیں کے
کہ ہیں ہم صبر کے بے خرچ مفلس ہیں دل و دیں کے

شعر میں بڑی تعقید ہے۔ بے خرچ کے دو معنی لئے جا سکتے ہیں ایک تو یہ کہ خرچ کرنے کو کچھ نہ ہو۔ دوسرے بدشگونی کے خیال سے برعکس محاورہ استعمال کیا ہے۔ جیسے دسترخوان اٹھانے کو دسترخوان بڑھانا کہتے ہیں۔ گویا ہے تو بہت کچھ پاس مگر خرچ کرنے کا موقع نہیں۔ اس کے برعکس معنی وہی مفلس کے ہوئے

بدگماں زاہد یقیں سے پاکبازوں پر نہ رکھ ‌ ‌ ‌ ‌ دیکھ کہیں سر پر پڑے گا بے گناہوں کا وبال

ترکیب مقلوب ہے۔

تیری زلفوں سے دل شیون میں ایسا ہے کہ گر سنتا ‌ ‌ ‌ ‌ صدا اس چینی مو دار کی فغفور رو دیتا

چینی مودار بہت بری ترکیب ہے۔ سودا نے اس فارسی ترکیب سے اجتناب کر کے لکھا ہے ؎

کب دل شکستہ لب پر یہاں عرضِ حال آیا ‌ ‌ ‌ ‌ ہے بے صدا وہ چینی جس میں کہ بال آیا

جانتا تھا کوہکن، شیریں کی دل سختی کا لطف   جس کو ہو سر پھوڑنا جانے وہ ہی پتھر کی قدر

یہاں بھی ترکیب مقلوب کا استعمال ہوا ہے۔

حروف کا ترک (۸) کہیں کہیں یقین نے حرفوں کو بھی گرا دیا ہے۔ مثلاً: ~

رفیقانِ موافق ساتھ زنداں بھی گلستاں ہے   ہوا ہے دام ہم کو آشیاں آپس کی الفت سے

اس شعر میں حرف "کے" ترک ہو گیا ہے۔

گلی میں یار کی دل بھول جا پڑا تھا یقیں   پھر ان دنوں سے دیوانہ کا کچھ سراغ نہیں

یہاں حرف "کر" محذوف ہے۔

ناصح جو یہ نصیحتِ بے جا نہیں سنی   معذور رکھ تو مجھ کو میرا دل بجا نہ تھا

یہاں "نے" چھوٹ گیا ہے اور نہیں کی جگہ "نہ" استعمال ہوا ہے۔

ہم مضمون اشعار اس کے بعد میں وہ اشعار دیتا ہوں جو یا تو فارسی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ یا ان کا مضمون اُردو میں لیا گیا ہے یا دوسرے ریختہ گویوں کے اشعار کے ہم مضمون ہیں لیکن ہر صورت میں آپ دیکھئے گا کہ یقین کے ہاں جدت کا پہلو ہے۔ اگر کسی فارسی شعر کا مضمون اُردو میں لیا ہے یا ترجمہ کیا ہے تو اس کو اصل شعر سے بہت بڑھا دیا ہے یا الفاظ کو اس طرح بٹھایا ہے کہ مضمون کی وسعت کے ساتھ طرزِ ادا میں شوخی پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے ان کے استاد ہی کے شعر سے بسم اللہ کرتا ہوں: ~

(مرزا مظہر) اے بادِ صبا ادب ضرورست   این مشہدِ ماست گلستان نیست

(یقین) یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے قدم سنبھال کے رکھیو نرا یہ باغ نہیں

یقین کے ہاں غضب کی شوخی ہے اور لفظ "نرا" نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ ان دونوں شعروں کے دیکھنے سے بھی استاد اور شاگرد کے کلام کا فرق معلوم ہو سکتا ہے۔

(حافظ) بکشائے تربتم را بعد از وفات و بنگر کز آتشِ درونم دود از کفن برآید

(یقین) اس داغ دار دل کو گاڑو نہ ساتھ میرے ڈرتا ہوں مت لگے اُٹھ آتش میرے کفن میں

یقین کے اس شعر کو بھی توارد کہا جاتا ہے۔ طریقۂ ادا اور وسعتِ معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔

(حافظ) گفتم خوشا نسیمے کز باغِ خلد خیزد گفتا خنک ہوائے کز کوئے دلبر آید

(یقین) دل میں نرا ہے کہ جو جنت کی ہوا لگی ہے ہوس کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

(حافظ) چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

(یقین) عشق کو ایامِ پیری میں یقین موقوف رکھ کیوں بچھڑتا ہے بڑھاپے میں جوانوں کی طرح

حافظ نے اپنے شعر میں کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ لیکن یقین نے دوسرے مصرعہ میں وجہ کا اظہار کر کے شعر میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ حافظ صرف کہتے ہیں کہ "ایسا کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا" یقین کہتا ہے کہ "پہلے اپنے ڈنڈ قبضوں کو دیکھ لو۔ کیوں خواہ مخواہ پٹنے کا ارادہ کیا ہے۔"

ان دونوں شاعروں کی تعلّی بھی بہت ملتی جلتی ہے ~

(حافظ) در آسماں چہ عجب گر زگفتۂ حافظ   سماعِ زہرا بہ رقص آورد مسیحا را

(یقین) سخن کے سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے   مری زمینِ غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

یقین کے الفاظ کی نشست و مناسبت کسی طرح حافظ کے شعر سے کم نہیں ہے۔

(حافظ) شب تار است و رہِ وادیِ ایمن در پیش   آتشِ طور کجا وعدۂ دیدار کجاست

(یقین) فیض ہوتا ہے کہیں پر نہ مکاں پر نازل   ہے وہی طور وہے شعلۂ دیدار کہاں

(سعدی) سرو را مانی ولیکن سرو را رفتار کو   ماہ را مانی ولیکن ماہ را گفتار نیست

(یقین) یار کے قد کو نہ دے سرو سے تشبیہ یقین   سرکشی میں تو مسلّم وے طنّاز نہیں

سعدی نے یار کے قد کو سرو سے تشبیہ دی ہے۔ مگر رفتار نہ ہونے کی وجہ سے اس کو قدِ یار سے کمتر کر دیا ہے۔ یقین نے بھی وہی تشبیہ دی ہے۔ مگر نقص کی وجہ دوسری بتائی ہے۔ شاعر سمجھ سکتے ہیں کہ "طنّاز" کا لفظ "رفتار" سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ ہاں جس نے کسی "بتِ طنّاز" ہی کو نہ دیکھا ہو وہ اس شعر کا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔

(سعدی) پائے در زنجیر پیشِ دوستاں   بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

(یقین) رفیقانِ موافق ساتھ زنداں بھی گلستاں ہے   ہوا ہے دام ہمکو آشیاں آپس کی الفت سے

معنی دونوں شعروں کے ایک ہی ہیں مگر یقین طریقۂ ادا اور مناسبتِ لفظی

ہیں یقیناً سعدی سے بڑھ گیا ہے۔

(سعدی) برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار

(یقین) ڈھب نہیں ہے خلق کی آنکھوں کو نظارہ کا ہائے — بھر رہا ہے رنگ سے جلوہ کے قدرت کا چمن

(سعدی) مجو چشمِ وفا زیں بلبلاں چشم — کہ ہر دم بر گلِ دیگر سرایند

(یقین) گل و بلبل کی صحبت کیا نہیں دیکھی یقیں تونے — جو امیدِ وفا رکھتا ہے تو ان خوب رویاں سے

یقین نے جس خوبصورتی سے اس مضمون کو ادا کیا ہے وہ تعریف کے قابل ہے
پہلے عاشق و معشوق کی حالت کا نقشہ دکھا دیا۔ اور اس کے بعد نصیحت کی۔ نصیحت کا
بہترین طریقہ یہی ہوتا ہے۔

(ملا شیدا[1]) طالعِ شہرت رسوائی مجنوں بیش ست — ورنہ طشتِ منِ او ہر دو زیک بام افتاد

(یقین) یقین اقبال ہاتھ آتا نہیں کچھ جی کے جانے سے — نہیں ہونے کے ہم فرہاد گر سو بار سر چیریں

ملا شیدا کا شعر ضرب المثل ہو گیا ہے۔ مگر انصاف شرط ہے یقین کا شعر بھی کچھ
اس سے دبا ہوا نہیں ہے۔ کہتا ہے ہم بھی آدمی ہیں فرہاد بھی آدمی تھا۔ ہم بھی عاشق ہیں
وہ بھی عاشق تھا۔ قسمت کی بات ہے کہ وہ اتنا مشہور ہو گیا۔ ہم سو دفعہ بھی مر کر جئیں تو
اس جیسا نام نہ پائیں گے۔

---

[1] ملا شیدا۔ فتح پور کے شیخ زادوں میں تھے جہانگیر بادشاہ کے آخری زمانہ میں ان کی شاعری نے
شہرت پکڑی۔ زرا منھ پھٹ تھے اس لئے دربار میں جیسا چاہیئے ویسا اثر پیدا نہ کرسکے ۱۰۶۲ھ میں
بمقام کشمیر انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے ۱۲

(سنائی) مکن در جسم و جان منزل کہ ایں دون ست وآں ادنیٰ
قدم زیں ہر دو بیروں نہ ۔ نہ اینجا باش و نے آں جا

(یقین) یار گر منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر — منزلِ مقصود ہے دونوں حجابوں کے پرے

یقین نے بعض فارسی محاروں اور ضرب الامثال کو بھی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔
دیکھنا "ہمیں گوے وہمیں میداں" کو کیا خوبصورتی سے باندھا ہے۔

مجنوں نے جو یہ دھومیں دوری سے مچائی ہیں — ہے نشہ تو آجائے ۔ یہ دشت یہ ویرانہ

"ایں گناہے ست کہ در شہرِ شما نیز کنند" کو اُردو کے رنگ میں ملاحظہ کیجئے۔

گیا ہو گا نہ تو کیا یار کی گلیوں میں راتوں کو — نئی تقصیر میں نے ہی نہیں کی۔ اے عسس چپ رہ

اب یقین اور اس کے چند معاصرین اور متاخرین کے اشعار کا مقابلہ کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں ۔ جن کو خدا نے شوق اور ذوق دیا ہے وہ خود بہت سے اشعار مقابلہ کے لئے نکال لیں گے ۔ میں اپنے اوپر کیوں خواہ مخواہ بار لوں ۔

(یقین) اب تلک ویراں پڑا ہے یہ جنوں کا پایہ تخت — پھر کسی نے بعد مجنوں کے نہ دی ہاموں کی داد
(میر) سچ ہے کہ ہے مکان کی رونق مکین سے — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

(یقین) جی میں آتا ہے ترے قد کو دکھا دیجے اسے — باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس
(میر) سرو و شمشاد چمن میں قد کشی کی ہے نزاع — تم ذرا واں چل کھڑے ہو فیصلہ ہو جائے گا

میر کے اس شعر کی ہمیشہ تعریف کی جاتی ہے ۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے

معنی کیا ہیں۔ سرو اور شمشاد میں جھگڑا ہے۔ اگر بار وہاں گیا تو میں ماننے کو تیار ہوں کہ دونوں شرمندہ ہو جائیں گے۔ مگر ان دونوں میں جو جھگڑا ہے وہ کیوں کر رفع ہوگا اور کس کو کس پر ترجیح دی جائے گی یقین کے ہاں یہ کمزوری نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شمشاد اپنے قد پر بہت اینٹھتا ہے۔ تم کو لے جا کر وہاں کھڑا کر دیتے ہیں وہ خود بخود شرمندہ ہو کر جھک جائے گا۔ اکڑنے کی انتہا "کہ بس" سے ظاہر کی گئی ہے۔ اس سے پیارا لفظ اس موقع کے لئے زبانِ اردو میں تو نہیں مل سکتا۔

(یقین) لاچار لیکے دل کو گیا گور میں یقین — اس جنس کا جہاں میں کوئی قدرداں نہ تھا

(میر) کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر — گویا جنسِ ناروا ہیں ہم

(یقین) نہ وہ دل ہے نہ وہ شورِ جنوں ہے سیرِ گل مت کر
رفیقوں بن یقیں گلزار میں جانے کا کیا حاصل

(سودا) وہ ہم نہیں کہ کریں سیر بوستاں تنہا — بہشت ہو تو نہ منہ کیجئے باغباں تنہا

(یقین) ہم سے گر سر نہ نوا اہلِ تکبر کا تو کیا — فخرِ آدم ہے جو ابلیس کا مسجود نہیں

(احسان[۱]) کر سجدۂ تعظیم بزرگوں کو ضرور — آدم کو جو سجدہ نہ کرے شیطاں ہے

---

[۱] احسان۔ نام عبدالرحمٰن خاں تخلص احسان اور خطاب صمصام الدولہ تھا۔ ذوق سے پہلے ان کا دہلی کے قلعہ میں بڑا دور دورہ تھا۔ تمام قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ جگت استاد مانے جاتے تھے۔ ۵۰ برس کی عمر پا کر ۱۲۶۷ھ میں دہلی ہی میں فوت ہوئے ۱۲

(یقین) شوق کہتا ہے کہ پکڑ لوں دوڑ کر دامانِ یار | کیا کروں مستی سے کچھ ہاتھوں میں گیرائی نہیں
(حضور[1]) نہ پاؤں میں ہے جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت | جو اُٹھ کھینچیں دامن ہم اُس دل رُبا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے | کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

(یقین) یہ جیوے ہجر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا
تکلف برطرف۔ بلبل کو پروانہ سے کیا نسبت

(لا اعلم) نسبت نہ ستی سے دو پتنگے کے تئیں | اس سے اُس کو تو کوئی نسبت ہی نہیں
دیتی ہے یہ جان، تو مرے کے لئے | وہ گرد بھی شمع کے پھرتا بھی نہیں

یقین کا شعر ایسا ہے کہ وہ زبانِ اردو کے لئے باعثِ فخر ہے۔ کیا بلحاظ مضمون اور کیا بلحاظ نشستِ الفاظ ایسے شعر کسی زبان میں ذرا مشکل سے ملیں گے۔ یہی کیا دیوانِ یقین میں اکثر ایسے اشعار ہیں جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ جواہر پارے تھے جو ہماری غفلت سے خاک میں دبے پڑے تھے۔ اگر باہر آنے کے بعد بھی ان کی قدر نہ ہوئی تو یہ ان کا قصور نہیں ہمارا قصور ہوگا۔

(یقین) مصر میں حسن کی وہ گرمیِ بازار کہاں | جنس تو ہے۔ پہ زلیخا سا خریدار کہاں
(بیان) کوئی اس جنس کا دلّی میں خریدار نہیں | دل تو حاضر ہے ولیکن کہیں دلدار نہیں

---

[1] لالہ بالمکند حضور۔ دہلی کے رہنے والے اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ زبانِ عربی سے بھی واقف تھے۔ اسی برس کی عمر پا کر دہلی میں ۱۲۶۲ھ کے قریب فوت ہوئے ۱۲

(یقین) مت اختلاط کر اے نوبہار اب ہم سے — چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں
(انشا) نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

(یقین) زیارت باغ کی کرتی ہے آنسو سے وضو کر کے — حباب گل میں رکھتی ہے عجب صدق و صفا بلبل
(ذوق) غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے — مگر زیارتِ دل کیوں کہ بے وضو کرتے

(یقین) نمک ڈالا ہے مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے — کہیں کھائے ہیں تو نے اس مزے کے استخواں سچ کہہ
(ذوق) واہ واہ شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک — استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہے

(یقین) اے واعظ ہمارے پاس ہے آتش محبت کی — کہ جس کو دیکھ زہرہ آب ہو جائے جہنم کا
(ذوق) ہمارے سینہ میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق — کہ برق دیکھے تو فی النار و السقر ہو جائے

(یقین) اگر بخیر ہمیں یاد کر نہیں سکتا — کبھو بُرا ہی ہمیں کہہ کہ تیرا بھلا ہووے
(غالب) قطع کیجئے نہ تعلّق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(یقین) شکوہ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں — یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا
(غالب) پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

(یقین) عمر فریاد میں برباد گئی۔ کچھ نہ ہوا — نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے
(غالب) غلطہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

(یقین) اب تو کرے نگہِ لطف کہ ہو توشۂ راہ — کہ کوئی دم میں یہ بیمار سفر کرتا ہے
(امیر مینائی) دمِ اخیر تو ظالم کوئی نگاہ ملے — کچھ اس غریب مسافر کو زادِ راہ ملے

یقین کا ایک شعر ہے ؎

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

اسی مضمون کو محمد صادق خاں اختر[1] نے لے کر قطعہ کیا ہے اور وہ قطعہ ایسا مرغوب ہوا کہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو المتخلص بہ رمز نے اس کو خمسہ کیا۔ محمد حسین آزاد نے اس خمسہ کو ذوق سے منسوب کیا ہے۔ قطعہ مزے کا ہے اس لئے لکھ دیتا ہوں۔ قطعہ کو یقین کے شعر سے ملا کر دیکھئے اس نے ایک ہی شعر میں سارے قطعہ کا رنگ پیدا کر دیا ہے ؎

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر ساقیا! — دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا

---

[1] قاضی محمد صادق خاں اختر ہگلی کے رہنے والے تھے۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں بھی آکر رہے۔ مرزا قتیل کے شاگرد ہوئے اور یہیں تحصیلدار ہو گئے۔ تذکرۂ آفتاب عالمتاب، محامد حیدری اور دیوان فارسی و ریختہ ان کی یادگار ہیں۔ فنِ شعبدہ اور کیمیا گری میں بھی دخل تھا۔ ۱۲۹۰ھ کے قریب انتقال کیا ۱۲

کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے یہ طنز
معلوم ہوگا حشر ہیں بنا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجئے نہ آپ مجھکو جو مورد عتاب کا

تقوے ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے پاس اجتناب کا

مے ہو وے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ وش
اور وہاں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بےحیا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا وہ منھ سے ملا کے منھ
یہ ریش جس میں جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر آپ خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

قطعہ اچھا ہے اور واقعی اچھا ہے۔ مگر یقین نے جو بات دو مصرعوں میں پیدا کر دی ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ اس نے تین چیزیں یعنی معشوق، شراب اور خلوت جمع کر دی ہیں اس کے بعد زاہد سے پوچھتے ہیں کہ حضرت آپ ہی بتائیے کہ ایسے موقع پر آپ کی نیت بگڑے گی یا نہیں۔ ان چیزوں کی موجودگی میں تو بڑے بڑے زاہدوں کے تقوے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہر حال یقین کا یہ شعر میری زبان میں "بے مثل" اور آج کل کی زبان میں "شاہکارہ" ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ اس قسم کے مضمون کے آخر میں شاعر کے بہترین اشعار کا انتخاب

دیا جاتا ہے۔ میں اس عام طریقہ کو ترک کرتا ہوں۔ ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ جو شعر مجھے پسند ہو وہ آپ کو بھی پسند آئے۔ اس لئے میں آخر میں وہ اشعار دیتا ہوں جو ذرا اُلجھے ہوئے ہیں اور جن کے سلجھانے میں کچھ دقّت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اپنی عقل کے موافق ان کی صراحت بھی کر دیتا ہوں۔ اب رہے اچھے اشعار ان کا انتخاب خود ناظرین دیوان دیکھکر کر لیں۔

لگی ہے سب خدائی نفی و اثبات پر اپنے	موحّد دیکھکر اس وقت کے منصور کیا کرتا

یہاں "خدائی" کے معنی "دنیا بھر کے لوگ" ہیں شاعر کہتا ہے کہ آج کل ایسا رنگ بگڑا ہے کہ نفی و اثبات کے جس قدر مسائل ہیں وہ ہر کوئی اپنے سے متعلق کر رہا ہے۔ بچارے منصور نے ایک مسئلہ کو اپنے سے متعلق کیا تھا اس کو سولی دیدی گئی۔ اگر منصور ان لوگوں کو دیکھتا جو موحّد ہونے کے دعویدار ہیں تو خدا معلوم کیا نہ کر گزرتا اور خبر نہیں خدائی سے بڑھکر اور کیا دعوی کر بیٹھتا۔ دیوان کے ایک نسخہ میں پہلا مصرعہ اس طرح ہے "لگے ہیں سب خدا کے نفی و اثبات اپنے پر" اس مصرعہ میں ذرا اُلجھاؤ کم ہے۔ معنی وہی ہیں جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں۔

گلشن حسن سپاہی کی جفا ہے آبیار	رنگ خونخواری سے پکڑے ہے شجاعت کا چمن

سپاہی کا حسن اس کی بہادری ہے۔ شعر کے معنی یہ ہوئے کہ جب جفا کی جائے اس وقت سپاہی کی بہادری اپنا رنگ دکھاتی ہے اور جتنی سختی کسی بہادر کے مقابلہ میں کی جائے اتنا ہی اس کی شجاعت کا اظہار ہوتا ہے۔

اصول عشق یہ تولیں تو زمزمہ اس کا	نہیں درست۔ جو بلبل شکستہ بال نہیں

اس شعر میں بڑی بری تعقید ہے۔ اس کو اگر اس طرح نثر کیا جائے تو معنی صاف ہو جاتے ہیں "جو بلبل شکستہ بال نہیں اگر اس کا زمزمہ اصول عشق پر تولیں تو درست نہ ہوگا"۔ یعنی ایسی بلبل کے زمزمہ

میں مزا ہی جو شکستہ دل اور زخم خوردہ ہو اور اسی کا زمزمہ اصولِ عشق کی میزان میں پورا اُتر سکتا ہے۔

نگہ تیرے ہو جیسے عکس آئینہ کا چینی میں ۔۔۔ یہ سب باتیں سمجھ کر جان شرمانے کا کیا حاصل

یہاں آنکھ کو آئینہ سے اور نگہ کو آئینہ کے عکس سے تشبیہ دی ہے اور یہ سائنس کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ آنکھ لینس ہے اور نظر اس میں سے نکلی ہوئی معکوس شعاعیں۔ دوسری تشبیہ معشوق کے صفائی حسن کو چینی سے دی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تیری طرف اگر دیکھتا بھی ہوں تو خواہ مخواہ تو شرماتا کیوں ہے۔ میری نگاہ تیرے حسن پر جمتی تھوڑی ہے۔ یہ تو اس طرح گزر جاتی ہے جس طرح چینی پر سے آئینہ کا عکس اثر کئے بغیر تیر جاتا ہے۔ تیرنے کا لفظ سارے شعر کی جان ہے اور دونوں تشبیہیں بالکل نئی ہیں۔ دیوان کے ایک نسخہ میں پہلا مصرعہ یوں ہے ع نگہ تیری ہے یوں جوں آئینہ حیران رہتا ہو پہلے مصرعہ کی جگہ یہ مصرعہ لگا کر پڑھو تو شعر بالکل معمولی ہو جاتا ہے۔ غالب نے بھی اس مضمون کو باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا ۔۔۔ مستی سے ہر نگہ تیرے رخ پر بکھر گئی

جب ہوا معشوق عاشق۔ دلربائی کیا کرے ۔۔۔ بندگی کی جس نے خو کی۔ وہ خدائی کیا کرے

اس شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے صرف اس لئے لکھدیا ہے کہ فطرتِ انسانی کے ایک مسئلہ کو اس میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے۔ اگر کوئی فاتح قوم مفتوح ہو جائے اور ایک عرصہ تک اس غلامی میں بسر کرے تو اس کے اخلاق ایسے خراب۔ اس کے خیالات اور ارادے ایسے پست اور ہمت ایسی جواب دیجاتی ہے کہ پھر مدتوں تک اس میں حکومت کرنے کی قوت نہیں آتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہلکاروں کو عہدہ دار بنانے اور سندھ والوں کو سوراج دینے میں تامّل کیا جا رہا ہے۔

لیجئے۔ مجھے جو کچھ لکھنا تھا۔ وہ میں نے لکھدیا۔ اب آپ جانئے اور یقین کا دیوان جانئے خود پڑھ لیجئے پسند آئے تو کتب خانہ کی زینت بنائیے۔ ورنہ اٹھا کر طاقِ نسیاں پر رکھدیجئے۔ والسلام

مرزا فرحت اللہ بیگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف (الف)

کون کرسکتا ہے اُس خلّاقِ اکبر کی ثنا — نارسا ہے شان میں جس کے پیمبر کی ثنا

سربرآ اِس منھ سے ہو سکتی ہے کب نعتِ رسول — یا ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کی ثنا

یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے، جو کیجے — حضرت زہراؓ کی اور شبیرؑ و شبّرؑ کی ثنا

نام حمد اور مدح کا لینا مجھے انصاف نہیں — کی ہے ساری عمر، ترکانِ ستمگر کی ثنا

جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقیں
حضرتِ استاد یعنی شاہِ مظہر کی ثنا

نہ مرتا میں اگر صدقہ ترے جانے کے کام آتا گرسنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

یہ کوہِ طور سرمہ ہو گیا سارا ہی کیا کہئے کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا

بتاں خوں کر کے میرا سب لگے آپس میں یوں کہنے یہ کافر جیوتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

اُڑا دی اس ہوا نے مشتِ خاکِ مسکیناں ناحق غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا

لیا گھیر اس یقیںؔ نے عشق کا آتشکدہ سارا
کوئی شعلہ بھی بچ رہتا تو پروانے کے کام آتا

طلا تجھ حسن کے شعلے کے آگے آب ہو جاتا تجھے گر دیکھتا رو پا بکل سیماب ہو جاتا

اثر خوبانِ فندق زیب کی انگلیوں میں یہ دیکھا کہ جو گرتا تھا اشکِ خوں وہاں عناب ہو جاتا

کمی کی خنجرِ قاتل نے اس کی پیاس کے حق میں کئی زخم اور گر لگتے تو دل سیراب ہو جاتا

اگر تجھکو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی تماشا ماہِ کنعانی کا اُس کو خواب ہو جاتا

یقیںؔ سوز و گداز اپنے کو گر اظہار میں کرتا
خدا شاہد ہے آتش کا بھی زہرہ آب ہو جاتا

تجھ آنکھوں سے اگر دل نہ کرتا شور کیا کرتا یہ شیشہ طاق سے گر کر نہ ہوتا چور کیا کرتا

جو اپنا پھوٹتا تھا سر صدا آواز چینی پر اگر سنتا دلوں کے ٹوٹنے کا شور کیا کرتا

نہ ہو وہ کیونکہ سرمہ جس کو دی ہو حق نے بینائی تجلی دیکھ کر لیتا نہ کوہِ طور کیا کرتا

لگی ہے سب خدائی نفی و اثبات پر اپنے موحد دیکھ کر اس وقت کے منصور کیا کرتا

ہوا جل کر شبِ ہجراں میں آگے صبح ہونے سے یقیںؔ کے داغ پر یہ مرہم کافور کیا کرتا

مجھے گر حق تعالیٰ کارفرمائے جہاں کرتا
بتوں کو میں بزور ان بیکسوں پہ مہرباں کرتا

خدا دیتا مجھے گر میر سامانی خدائی کی
تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کا باغباں کرتا

رہا میں بے خبر افسوس لذت سے اسیری کی
جو میں یہ جانتا کنجِ قفس میں آشیاں کرتا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں
جو میں ہوتا بجائے تیشہ تیشے خوں رواں کرتا

کیا مجھکو یقیںؔ اس ناتوانی نے خجل ورنہ
گلی کو یار کی لوہو سے اپنے گلستاں کرتا

اگر مرکر نہ میں اس شوخ کی خاطر نشاں کرتا
خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا گماں کرتا

نہ ہوتا اس کی بدخوابی کا ڈر مجھکو تو پھر پھر کر جب
گلی میں یار کی راتوں کو فریاد و فغاں کرتا

سمجھتا قدر میرے ضعفِ پیری کی سجن جب تو
جو تجھ سا کوئی تیرے تیر سے قد کو کماں کرتا

زباں فولاد کی ہو تب جوابِ کوہکن دیوے
ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا

نہ آیا سر فرو ادھر یقیںؔ کے فکرِ عالی کا
زمینوں کو وگرنہ ریختے کی آسماں کرتا

نہ آبِ تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر ملا سکتا
اس آب و رنگ سے کب نقشِ شیریں کو بنا سکتا

اجل تھی کوہکن کی وہ جو صورت باندھ آئی تھی
وگرنہ یہ خبر کوئی بھی دشمن کو سنا سکتا؟

یہ عشقِ سرشکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا
وگرنہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

اجل نے کوہکن کی خوب رکھ لی شرم خسرو کی
وگرنہ اس کے سنگِ در کو یہ کب اٹھا سکتا

اگر تیشہ نہ کرتا دستگیری اس بچارے کی
یقیںؔ فرہاد تیغِ کوہ کے کب منہ پہ آ سکتا

یہ دل ایسا خراب کوچہ و بازار کیوں ہوتا | اگر ملتا نہ اتنا گلرخوں سے خوار کیوں ہوتا

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ | یہ اتنا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

حقیقت میں یہ شعلہ عشق کا ہی برگِ گل ورنہ | خلیل اللہ پر آتشکدہ گلزار کیوں ہوتا

کسو کا بھی کبھو راکھا کرو دل تم کو لازم ہے | وگرنہ دلربا دُس کا لقب دلدار کیوں ہوتا

یقیںؔ امید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے
اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

کبھو یہ تھا کہ ہم پر وہ بتِ مغرور رو دیتا | بُرا جب دیکھتا حالِ دلِ رنجور رو دیتا

تری زلفوں سے دل شیون میں ایسا ہی کہ گر سنتا | صدا اس چینی مو دار کی فغفور رو دیتا

ہمیشہ کھینچتا ہوں اشکِ خوں کو دار مژگاں پہ | اگر سولی مری کو دیکھتا منصور رو دیتا

تری جا گہ اگر پتھر بھی ہوتا آب ہو جاتا | پھٹی چھاتی کو میری دیکھ کوہِ طور رو دیتا

سحر کے چاک پر روتا ہی جوں شبنم یقیںؔ میرا
جراحت دیکھتا گر مرہم کافور رو دیتا

نہیں معلوم اب کی سال میخانہ پہ کیا گزرا | ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانہ پہ کیا گزرا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے | خدا جانے تری صورت سے بت خانہ پہ کیا گزرا

مجھے زنجیر کر رکھا ہی ان شہری غزالوں نے | نہیں معلوم میرے بعد ویرانہ پہ کیا گزرا

ہوئے ہیں چور میرے استخواں پتھروں سے لڑکوں کے | نہ پوچھا یہ کبھی تو نے کہ دیوانہ پہ کیا گزرا

یقیںؔ کب یار میرا سوزِ دل کی داد کو پہنچے | کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانہ پہ کیا گزرا

ہے ترے داغ سے تر سینۂ سوزاں میرا
آب و رنگ آگ سے رکھتا ہے گلستاں میرا

غم کے ہاتھوں نہ رہا کچھ بھی رفو کے قابل
بسکہ سو بار ہوا چاکِ گریباں میرا

موجِ دریا کی طرح ضبط میں آسکتا نہیں
کوئی کیوں کر کہے احوالِ پریشاں میرا

روا اگر دیجئے اس کو بھی تو کچھ عیب نہیں
آئینہ سے بھی گیا کیا دلِ حیراں میرا؟

میں تو ظاہر نہ کروں اس کی جفا کو لیکن
چھپ سکے کیوں کہ یقیں زخم نمایاں میرا

نہ ہو جو دور میرے سر سے ظلِ عاطفت غم کا
نہ پڑ تو داغ پر میرے الٰہی سایہ مرہم کا

خداوندی کی چاہی ہے خلافت حق تعالیٰ نے ﷻ
کوئی مطلب نہیں پایا ہے یہاں آنے سے آدم کا

ارے واعظ ہمارے پاس ہے آتش محبت کی
کہ جس کو دیکھ زہرہ آب ہو جاوے جہنم کا

سبھی مرتے ہیں خوش وقتی پہ جی دیتے ہیں شادی پر
تکلف برطرف، یہ نوحہ گر نبارہ ہے ماتم کا

شکوہِ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں
یقیں، سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

ہیں زخم میرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا
اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سے کیا ہوگا

اس کم نگہی سے کب بجھتی ہے عطش دل کی
ساقی مجھے اتنی سی مے پینے سے کیا ہوگا

کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینہ کو آتی ہیں
دل سے نہ ہوا جو کام آئینے سے کیا ہوگا

مستوں کا غبارِ دل، کچھ مے نے نہیں چھوڑا
زاہد گزر اب تو بھیٔ اس کینے سے کیا ہوگا

جب یاں کے خزانے ہوں، تب کام چلے تیرا
دنیا کے، یقیں، تجھ کو گنجینے سے کیا ہوگا

گریباں پھاڑ ڈالے رشک سے ہر گلبدن اپنا ۔ نکالوں خاک سے جوں لالہ گر خونیں کفن اپنا
لگیگا ہاتھ پتھر اس طرح کی سعی ناحق سے ۔ پرائے دلبروں پر سر نہ چیرلے کوہکن اپنا
دیا بر باد رازِ عشق اس چاکِ گریباں سے ۔ نہ رکھا بوئے گُل کی طرح میں نے ہاتھ من اپنا
ہمارا جی نکل جاتا ہے جب یہ نوجواں ہم کو ۔ دکھاتے ہیں بھویں تیوری چڑھاکر بانکپن اپنا

یقیںؔ، اُس کے دُرِ دنداں کی باتیں جو کیا جانے
صدف کی طرح دھو لے آبِ گوہر سے دہن اپنا

تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بستاں کی ہوا ۔ باغ سے یوسف کو رنگیں تر ہے زنداں کی ہوا
لذتیں ساری گرفتاری کی جاتی ہیں برباد ۔ جب قفس میں یاد آتی ہے گلستاں کی ہوا
نہیں اتر سکتی کسی افسون سے کالے کی لہر ۔ کیوں کہ نکلے سر سے اُس زلفِ پریشاں کی ہوا
کیوں نہ ہو تر دامنوں کو شستِ شوئی آرزو ۔ میکشاں پر آیۂ رحمت ہے باراں کی ہوا

ہر گھڑی صحرا نشینی میں نہ کر جرأت یقیںؔ
آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

سرِ پرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا ۔ ہمیں ظلِّ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مجھے دکھ پھر دیا تو نے منڈا کر سبزۂ خط کو ۔ جراحت کو مرے وہ مرہمِ زنگار بہتر تھا
مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں ۔ کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا
ہموں نے ہجر سے کچھ وصل میں دھڑکے بہت دیکھے ۔ ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا
مرا دل مرگیا جس دن کہ نظارہ سے باز آیا ۔ یقیںؔ پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا

اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا
ملتے ہی میرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

اب جوں سرشک خاک سے سکتا نہیں ہوں اُٹھ
آ گے ہیں دل کی آنکھ سے اتنا گرا نہ تھا

ناصح جو یہ نصیحتِ بیجا نہیں سُنی
معذور رکھ تو مجھکو مرا دل بجا نہ تھا

مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی
دیکھا تو زندگی میں مزا کچھ رہا نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھکو یقیںؔ ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا ؟

اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا
جب حنا سے ترے پاؤں کو سروکار نہ تھا

حسن کا جذبِ زلیخا ستی کچھ چل نہ سکا
ورنہ یہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس
کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

دل مرا عشق کے دھڑکوں سے موا جاتا ہے
یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگردار نہ تھا

"آپ سے کیوں نہ موا" کہہ کے یقیںؔ کو مارا
رحمت پوچھو تو کوئی مجھ سا گنہگار نہ تھا

نہ تھا یہ وادئ ایمن یہ کوہِ طور نہ تھا
نرا تو ہی تھا تجلی کا واں ظہور نہ تھا

کہوں میں کیونکہ نہ صبح بہار تجھکو کہ آج
چمن میں تو جو نہ تھا گل کے منہ پہ نور نہ تھا

خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ
کہ میں تو مست تھا۔ کیا اُس کو بھی شعور نہ تھا

تری جدائی میں کیا کیا جفا اُٹھاتا ہوں
مرے جو پاس تو آتا وفا سے دُور نہ تھا

مرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقیںؔ
وگرنہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا

اس گل سے کچھ حجاب ہمیں درمیاں نہ تھا
جس دن کہ یہ بہار نہ تھی گلستاں نہ تھا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

یہ قمریاں جو سرو کی عاشق ہوئیں مگر
دنیا میں اور کوئی سجیلا جواں نہ تھا

کیوں کر ملی ہو گل سے جو آتی ہو خوش دماغ
اے بلبلو چمن میں مگر باغباں نہ تھا

لاچار لے دل اپنا گیا گور میں یقیںؔ
اس جنس کا جہاں میں کوئی قدرداں نہ تھا

گرا میں آنکھ سے تیرے۔ جہاں کے ہاتھ کیا آیا
مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا

مرے ان آنسوؤں نے کھو دیا نورِ بصر میرا
یہ یوسف بیچ کر اس کارواں کے ہاتھ کیا آیا

دماغِ گل دھوئیں سے خار و خس کے کر دیا ناخوش
جلا کر آشیاں کو باغباں کے ہاتھ کیا آیا

نہ کہتی رازِ دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی
فضیحت کر کے مجھکو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

یہ بیمار آپ مرجاتا۔ جو جلتا ان کے کام آتا
یقیںؔ کو مار کر زور آوراں کے ہاتھ کیا آیا

اس کو جب خشم و رضا میرا برابر ہو گیا[1]
حیف مضموں روٹھنے کا پھر مکرر ہو گیا

دلبروں کے نقشِ پا میں ہے صدف کا سا اثر
جو مرا آنسو گرا اس میں سو گوہر ہو گیا

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامہ کا بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

---

[1] مصحفی کے تذکرہ میں یہ مطلع اس طرح ہے:
کارِ دیں اس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا
جس مسلماں نے اسے دیکھا وہ کافر ہو گیا

آپ سے جب تک نہ تھا واقف کہاں تھا یہ شکوہ — دیکھتے ہی آئینہ میں منہ سکندر ہو گیا

آنکھ سے نکلے یہ آنسو کا خدا حافظ یقیں
گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

ردیف (ب)

گر نہ ہوتا آشیانِ بلبلِ غمگیں خراب — کر سکتا باغ کو۔ اے باغباں گلچیں خراب

کیا گرا دی ایک تیشہ سے بنا فرہاد کی — کر دیا کس گھر بسی نے خانۂ شیریں خراب

کس کے آگے جا کے سر پھوڑیں کہ کرتا ہے آہ — خاطروں کے شیشہ خانے وہ دلِ سنگیں خراب

صبر کیجے کب تلک ناصح کہ کرتا ہے عشق — حوصلہ کا شہر غارت خانۂ تمکیں خراب

پاؤں کو اپنے یقیں کے چشمِ گریاں پر نہ رکھ
مت کر۔ اے گل آبجو میں دامنِ رنگیں خراب

ہے بتوں کا کبر اور یہ نازِ استغنا' ادب — بد نما لگتا ہے جو کرتے ہیں یہ بیجا ادب

عشق کا ہے حسن کی گردن پہ حقِ تربیت — تب تو کرتے ہیں مرا خوبانِ بے پروا' ادب

نوک بعضے سرو کی ہوتی ہے جو خم' اس سے پوچھ — عالمِ بالا سے آتا ہے چلا' گویا' ادب

مینہ بھی کھل جاتا ہے اور ندیاں اتر جاتی ہیں دیکھ — چشمِ تر کا کرتے ہیں کیا ابر' کیا دریا' ادب

دشت سے اٹھتا ہے تواضع کو نہیں یہ گردباد
دیکھ دیوانوں کا کرتا ہے یقیں صحرا ادب

ردیف (ت)

تیری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت
نگہہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

جیوے ہجر میں، وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا
تکلف برطرف، بلبل کو پروانے سے کیا نسبت

وہ موتی ہیں جن کی سیپیاں آنکھیں ہیں عاشق کی
مرے آنسو کو مروارید کے دانے سے کیا نسبت

ارے دل، مت توقع دلبروں سے رکھ ترحّم کی
لہو پیتے ہیں جو شخص ان کو غم کھانے سے کیا نسبت

گل اس کا داغ ہے، اور سرو اُس کا آہِ موزوں ہے
یقیں سے نوحہ گر کو باغ میں جانے سے کیا نسبت

جہاں دل گم ہوئے، واں کون جا سکتا ہے، کیا قدرت
خبر ان یوسفوں کی کون لا سکتا ہے کیا قدرت

یہ جس نے بت تراشے ہیں وہی سمجھا بغیر اس کے
کہیں یہ صورتیں کوئی بنا سکتا ہے، کیا قدرت

بتوں کی مجھ سے خاطر جمع ہے یہاں تک کہ کہتے ہیں
کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہے کیا قدرت

ہمارا شورِ سخن، مجنوں کو بھولی طرز نالہ کی
کوئی شیریں کے منہ پر نَے بجا سکتا ہے کیا قدرت

یقیں، تائیدِ حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کون آ سکتا ہے کیا قدرت

ردیف (ث)

ہوا دیوانگی میری کا وہ گل پیرہن باعث
کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کو سیرِ چمن باعث

تصور کر کے لیتا ہوں مزا میں اس کی باتوں کا
مرے اس چپکے رہنے کا ہے وہ شیریں دہن باعث

محبت کا نہیں ہے ظلم بھی خالی عدالت سے
ہوا پرویز کے جینے کا مرگِ کوہکن باعث

توجہ سرو کی ہے، قمریوں کا نالہ موزوں ہے
سجیلی گفتگو میری کا ہے، میرا سجن باعث

خوش آتی کب ہے قیدِ زندگی مجھکو یقیں لیکن
مرے اس دام میں پھنسنے کا ہے وہ منہرن باعث

ردیف (ج)

کر سکے کیا عقل میرے غم کے جانے کا علاج
کام کب آتا ہے دیوانوں کو سیانے کا علاج

رنگ گل کی آگ پر دامن نہ مار۔ اے بادِ صبح
کیا کرینگی بلبلیں پھر آشیانے کا علاج

حق کو کب پہنچے۔ نہ باندھے جب تک ان زلفوں سے دل
کیونکہ ہو زنجیر بن۔ ایسے دیوانے کا علاج

گر طہارت چاہتا ہے تو۔ خدا کے واسطے
کاٹ سر۔ لوہو سے اپنے کر نہانے کا علاج

شیشۂ دل کے تئیں اپنے سنبھالے رکھ یقیں
پھر کرے گا کون اس کے ٹوٹ جانے کا علاج

ردیف (چ)

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زندان کے بیچ
آج زنجیر سے آتی ہے جھنک کان کے بیچ

زخمِ دل ہونے دے ناسور۔ نہ کر اس کا علاج
درد میں جو کہ مزا ہے نہیں درمان کے بیچ

میں دیوانہ ہوں تیرا مجھکو نہ مار۔ اے ظالم
قتل مجنوں کا پڑھا ہی کہیں قرآن کے بیچ

سامنے ہوتے ہی پھر لاش نہ پائی دل کی
بٹ گیا نوکِ سناں پر صفِ مژگان کے بیچ

جب سے پہنا ہی یقیں یار نے رنگیں جامہ
شور ہے غل ہے قیامت ہے گلستان کے بیچ

ردیف (ح)

روٹھ کر دل سامنے خوباں کے جاوے کس طرح
پھٹ گیا جی اس کا اب آنکھیں ملاوے کس طرح

باغباں بے رحم اور در بند دیواریں بلند
بلبل بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح

ہاتھ سیتی جا چکا جب یار تب آئی بہار
پی کے مے تنہا کوئی دھومیں مچاوے کس طرح

رنگ سے مہندی کے ہو جاتے ہیں آنسو لعل تر
رکھ کے ان پاؤں پہ کوئی سر اٹھاوے کس طرح

اختیاری ہے گریہ کام ناصح تو ہی کہہ
عشق سے کوئی یقیں کو باز لاوے کس طرح

خار سے مژگاں کے جی ڈرتا ہی میرا بے طرح
رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا بے طرح

خانماں آنکھوں کا کوئی پل میں جاتا ہی خراب
آنسوؤں کا جوش میں آیا ہی دریا بے طرح

بو نے تیرے سے جی اٹھتے ہیں جن میں جی نہیں
پھر مروّج ہو چلا دینِ مسیحا بے طرح

خوبرو حق میں مرے بد خو نکل جاتے ہیں آہ
کیا غلط کرتے ہیں میرے چشم بینا بے طرح

فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھئے کیا ہو یقیں
اب کے چلتا ہی جنوں پر دل ہمارا بے طرح

و جگہ سے دل، گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح
زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح

پھوڑ ڈالا کوہکن سا لعل یوں پتھر سے ہائے
کس سے سیکھی تھی یہ شیریں کام فرمانے کی طرح

عاشق اور معشوق عالم کی سند کرتے ہیں سب
تجھ سے خونخواری کی طرز اور مجھ سے غم کھانے کی طرح

جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھی آتی ہے یاد
وہ قسم کھا کر اسی ساعت مکر جانے کی طرح

گر یقیںؔ تو چاہتا ہے، یار ہو شمعِ فراز
کود جا، گر آتشِ سوزاں میں پروانے کی طرح

ردیف (خ)

نہ میرے چاک گریباں سے ہے رفو گستاخ
نہ میرے زخم سے مرہم کی آرزو گستاخ

ے ہے آئینہ بے طرح نکتہ چینیِ حسن
نہ کر تو اس کو اب اتنا بھی روبرو گستاخ

ے ادب سے جنوں کو گیا ہوں اتنا بھول
کہ ہاتھ جیب سے گویا نہ تھا کبھو گستاخ

یں اس دلیری سے پیتا ہوں خونِ دل اپنا
کہ جوں شراب کے پینے میں ہے سبو گستاخ

ہزار شکر یقیںؔ میں اگرچہ ہوں بے قدر
نہیں ہے مجھ ستی ہرگز وہ تند خو گستاخ

ردیف (د)

ن دے تیری نگہ بن جان، اشکِ خوں کی داد
غیر شیریں کون دے سکتا ہے اس گلگوں کی داد

چاہتا تھا میں کہ سارا غم ہو میرے ہی نصیب   آہ! غم نے بھی نہ دی اس خاطرِ محزوں کی داد
ڈھونڈتی پھرتی تھی دیوانے کو اپنے روز و شب   دلبری وہ تھی، جو لیلیٰ دے گئی مجنوں کی داد
اب تلک ویراں پڑا ہے یہ جنوں کا پایہ تخت   پھر کسی نے بعد مجنوں کے نہ دی ہاموں کی داد

کون ریجھے قامتِ رعنا پہ تیرے جز یقیں
غیر شاعر کون دے اس مصرعِ موزوں کی داد

ردیف (ذ)

کیا خزاں نے کر دیا ویراں گلستاں العیاذ   کس طرح سے بلبلیں پھرتی ہیں نالاں العیاذ
لوگ اسی وادی میں اب کرتے ہیں آہو کا شکار   بعد مجنوں یوں ہوئے بیکس غزالاں العیاذ
جب مرے گرتے ہیں آنسو، زہرہ ہو جاتا ہے آب   آہ، یہ عقدِ گہر یوں ہو پریشاں العیاذ
بات کہتے، ڈالتے ہیں پھوڑ یہ شیشہ سا دل   کس قدر یہ سنگدل ہوتے ہیں خوباں العیاذ

چاک کر ڈالا ہے تو نے اپنا سینہ بھی یقیں
پھاڑتا نہیں اس قدر کوئی گریباں العیاذ

ردیف (ر)

دل ہمیں کہہ کر چلا تھا اپنے جلنے کی خبر   پھر نہ دی ہم کو کسو نے اُس دوانے کی خبر
بلبلیں پیہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف   کچھ تو اُڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر

سچ کہو۔ اے بلبلوں۔ کس باغ سے آتی ہو تم
ہے ہمارے بھی تمھیں کچھ آشیانے کی خبر
نہیں پہنچا ضعف سے نالہ مرا صیاد تک
کون لے اس ناتواں کے آب و دانے کی خبر
باغباں کو جان کر مانع نہیں ہوتا یقیں
ورنہ سب ہے گل کو بلبل کے ستانے کی خبر

کون جانے بن تری آنکھوں کے چشم تر کی قدر
بوجھتے ہیں مردم بینا ہی اس گوہر کی قدر
جانتا تھا کوہکن شیریں کی دل سختی کا لطف
جس کو ہو سر پھوڑنا جانے وہ ہی پتھر کی قدر
اب جو اڑ بیٹھیں قفس کے بام پر مقدور نہیں
حیف ہم آگے نہ بوجھے اپنے بال و پر کی قدر
بوجھتا ہوں اے سجن تیری نگہ کے پیچ و تاب
جز مبصر کون جانے تیغ کے جوہر کی قدر
مجھ سے پتھر کو کیا ہے جوں نگیں حرف آشنا
کون پہچانے یقیں بن حضرت مظہر کی قدر

توقع دے کے مت کہہ ناامیدی کے سخن بس کر
جواب تلخ مت دے مجھ کو اے شیریں دہن بس کر
پھڑک کر جی نکل جاوے گا بلبل کی طرح میرا
کھلا۔ بند گریباں کو نہ رکھ۔ اے گلبدن بس کر
ہوئی ہے راکھ تس پر شعلۂ آواز باقی ہے
مت اتنا بھی جلا قمری کو اے سرو چمن بس کر
جو لوہا جس نہ دے اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل
بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر
بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقیں۔ کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبان چمن کیوں کر
نہ کیجئے چاک ناصح اس طرح اپنا پیرہن کیوں کر

کرے محنت کوئی لذت اٹھاوے یار سے کوئی — کہو اپنے تئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیوں کر

نہ دوانے گلرخاں تکلیف مجھکو شعرخوانی کی — کہو بن فصل گل کوئی کرے دیوانہ پن کیوں کر

موا جاتا ہوں گر سایہ پہ پڑتی ہی نظر میری — تیری سج دیکھکر احباب جیتے ہیں سجن کیوں کر

تعجب سخت رہتا ہی یقیں اس بات کا مجھکو
کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیوں کر

گرچہ شیریں شیخ کے ہی وجد میں آنے کا شور — پر قیامت بانمک ہوتا ہی میخانے کا شور

آہ و نالہ پر نہیں موقوف شہرت عشق کی — کس قدر ہی اس خموشی ساتھ پروانے کا شور

ہر طرف ہنگامہ ان آنکھوں کی مستی کا ہی گرم — بھر رہا ہی جس طرح عالم میں پیمانے کا شور

یہ زمیں سیلاب سے ہوتی نہیں ہی چاک چاک — دشت کی چھاتی پھٹے ہی سن کے دیوانے کا شور

کیا جنوں کو بے طرح شورش میں لاتا ہی یقیں
فصل گل میں بلبلوں کے باغ میں جانے کا شور

کیا مری مژگان تر کے ابر نے ڈالا ہی شور — آج بادل بے طرح اٹھے ہیں یہ برسینگے زور

عشق کے آئین میں صورت کیونکہ بگڑے ان کا دین — جو کہ جاتے ہیں طرف کعبہ کی بت خانے کو چھوڑ

خدمتوں میں بھی تجارت سے ہی زیادہ منفعت — رشوتوں میں تب تو لاکھوں دے کے لیتے ہیں کروڑ

خال گورے مکھ کا میرے دل کو لیتا ہے چرا — اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چور

کس کا ماتم ہی یقیں جو اس طرح روتا ہی ابر
کوکتی ہیں کوئلیں اور شور یوں کرتے ہیں مور

شاخِ گل کو سرخ جوں شمشیر کرتی ہے بہار
قتل میں بلبل کے کب تقصیر کرتی ہے بہار

کیا قیامت ہے کہ صفحہ پر چمن کے رات دن
کربلا کا واقعہ تحریر کرتی ہے بہار

باغ کے کوچہ سے دیوانے نکل سکتے ہیں کب
رنگِ گل کی موج سے زنجیر کرتی ہے بہار

نشترِ فصّاد کر رکھا ہے ہر پتّے کے تئیں
اپنے دیوانوں کی کیا تدبیر کرتی ہے بہار

کیا چمن کی گل زمیں میں ظلم ہوتا ہے یقیں
خار کو گلبن کا دامنگیر کرتی ہے بہار

ردیف (ڑ)

عقل گر رکھتا ہے بے موجب دِواتوں کو نہ چھیڑ
باغباں ان بلبلوں کے آشیانوں کو نہ چھیڑ

آگ جوں بھرتا ہے نے میں اس طرح کی آگ ہی
بھر رہی ہے اے ہما ان استخوانوں کو نہ چھیڑ

دردمندوں کے تو لیتا ہے عبث خوں کا وبال
مر رہے ہیں آپ یہ ان ناتوانوں کو نہ چھیڑ

ایک شب تو یار کی گلیوں میں جانے دے ہمیں
اس قدر بھی پاسباں بے خانمانوں کو نہ چھیڑ

عشق کو ایام پیری میں یقیں موقوف رکھ
کیوں پچھڑتا ہے بڑھاپے میں جوانوں کو نہ چھیڑ

ردیف (ز)

آگے لبوں کے ہو نہ سکا خطِ یار سبز
ہوتا ہے کب شراب کے آگے خمار سبز

تیری نگاہِ گرم سے دہکا ہی دل کا داغ ہوتا ہی جیسے آگ سے تخمِ شرار سبز
گویا اُڑا دیا ہے کسی نے حنا کے تئیں ایسا ہوا ہی فیضِ ہوا سے غبار سبز
پروا نہیں ہی ابر کی اس مشتِ خاک کو کریں گے اشکِ سرخ ہمارا مزار سبز
ہو کم ہیں خط کے حُسن سے، ایمن نہ رہ یقیں
کرتے ہیں جامہ بریں بوقتِ شکار سبز

خوش نہیں آتا ہی مجنوں بن ہمیں صحرا ہنوز ان غزالوں سے ہمارا دل نہیں لگتا ہنوز
اب تلک کرتا ہی تیشہ، کام میں پتھر کے دخل مانتا ہی کوہکن کے نقش کو خارا ہنوز
مو نکالے پر بھی مستی حسن کی نکلی نہیں بھر رہا ہی مے سے معشوق کے مینا ہنوز
باوجود اس کے کہ ہی زخموں کے مارے خوں میں غرق آبِ خنجر کو ترستا ہی جگر میرا ہنوز
ہی یقیں کا عشق سے ہر روز بانِ احتیاج
اس پہ کم ہوتی نہیں اس کی وہ استغنا ہنوز

بعد مرنے کے بھی ہوں گور میں غمناک ہنوز گرد پھرتے ہیں میری خاک کے افلاک ہنوز
پی کے مستوں نے زمیں پر جو گرائی تھی شراب سبز ہوتا ہی اسی سے شجرِ تاک ہنوز
چھوڑتا عشق نہیں مجھکو تو مانندِ سحر ہو گیا پیر، گریباں ہی مرا چاک ہنوز
سبزہ اُگنے کا نہیں مجھ پہ برس مت اے ابر گرم ہی آتشِ سودا سے مری خاک ہنوز
گرچہ ہوں غرق بخوں عشق میں خوباں کے یقیں
نیک دامن ہی مرا گل کی طرح پاک ہنوز

ردیف (س)

آج دیکھا ہوں میں اس لطف کی بیداد کہ بس
سر پہ آیا مرے اس طور سے جلاد کہ بس

جی میں آتا ہے، ترے قد کو دکھا دیجے اسے
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس

بلبلیں کیوں کہ گرفتار نہ ہوں اس سج کی
اس طرح باغ میں پھرتا ہے یہ صیاد کہ بس

کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی تب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس

تو نہ تھا حیف، یقیںؔ ورنہ وہ دانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

منہ پہ کھاتا ہے یہ اس طرح سے تلوار کہ بس
دل مرا عشق میں ایسا ہے جگر دار، کہ بس

نزع میں دیکھ مجھے، یار جھجک کر بولا
کیا بُری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار، کہ بس

آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
کیا خریدار نے پایا ہے خریدار، کہ بس

اس جھڑی سیتی کہیں گر نہ پڑے بامِ فلک
اس طرح روتے ہیں تجھ بن، در و دیوار کہ بس

عشق کے دارِ شفا میں مجھے مت چل تو یقیںؔ
کہ طبیبوں نے دیا اس قدر آزار، کہ بس

آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس
ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس

ہمصفیروں کی جدائی سے ہے خاطر بس تنگ
مجھکو ہے اس دلکشائی ساتھ، یہ صحرا قفس

کچھ نہ دیجیو دکھ مرے صیاد کو مرنے کے بعد
قبر اور تابوت ہی کر لیجیو میرا قفس

تنگ تو کرتا ہے، پر ہم جو کبھی جاتے رہے ۔۔۔ تو پڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

اس گرفتاری کا پایا ہے مزا جب سے یقیں
تب ستی یاد دام خوش آتا ہے ہم کو یا قفس

ردیف (ش)

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش ۔۔۔ روز و شب لیلیٰ کو تھا در پیش مجنوں کا تلاش

اشک رنگیں سے گلی تیری کو مشہد کر دیا ۔۔۔ مر گئے ہیں دیکھ کر اس چشم پُر خوں کا تلاش

جس طرح سے ڈھونڈتے ہیں لوگ خاطر ہائے شاد ۔۔۔ اس طرح رہتا ہے مجھکو جانِ محزوں کا تلاش

جی سے میرے سانورے کی لگ رہی ہے جستجو ۔۔۔ جس طرح ہوتا ہے افیونی کو افیوں کا تلاش

شاعری ہے لفظ و معنی سے تری لیکن یقیں
کون سمجھے، یہاں تو ہے ایہام مضموں کا تلاش

ردیف (ص)

مرے جنوں پہ نہ تنہا کرے ہے مجنوں رقص ۔۔۔ کرے بگولے کی صورت پکڑ کے، ہاموں رقص

یہ شاخِ گل متحرک صبا سے نہیں، کہ چمن ۔۔۔ کرے ہے دیکھ کے تیری قبائے گلگوں رقص

ترے ستم سے مرا جی یہ کچھ دھڑکتا نہیں ۔۔۔ خوشی سے قتل کے، کرتی ہے جانِ محزوں رقص

یہ گرد باد نہیں دشت میں کہ کرتی ہے ۔۔۔ میرے جنوں کے تئیں دیکھ روحِ مجنوں رقص

سخن کے سحر سے، نزدیک ہی یقیںؔ کہ کرے
مری زمینِ غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

ردیف (ض)

کب سنے زنجیر مجھ مجروح دیوانے کی عرض
نہیں پہنچتی کان تک اُس زلف کے، شانے کی عرض

گرمیِ اہلِ بزم سے مت کر، کہ میں ہوتا ہوں داغ
شمع کی خدمت میں ہے اتنی ہی پروانے کی عرض

شیشہ مجھ دل سا نہ پاوے اور تیری آنکھوں سا جام
لے اگر ساقی ہزاروں سال میخانے کی عرض

دل کو ویراں مت کرو، یہ ہے جنوں کا پایہ تخت
اے پری زادو، کبھو سنئے بھی دیوانے کی عرض

فصل جاتی ہے یقیںؔ اور باغباں سے ایک بار
کوئی کرتا نہیں، ہمارے باغ میں جانے کی عرض

ردیف (ط)

مت خدا کے واسطے کر دلبراں سے اختلاط
کفر ہے حق میں مسلماں کے بتاں سے اختلاط

سرو کہتا ہے، زبانِ حال سے تجھ قد کو دیکھ
"کیونکہ کیجے ہائے اس عصا جواں سے اختلاط"

باغ ہی کا جب خزاں سے ہو گیا خانہ خراب
کیا رہے تب بلبلوں کو آشیاں سے اختلاط

تیرے عارض کا خیال اس دل سے یوں رکھتا ہے ربط
جیوں کہ آئینہ کو ہے آئینہ داں سے اختلاط

مختلط ہیں نالہ و فریاد مجھ دل سے یقیںؔ
ہے سخن کو جس طرح میری زباں سے اختلاط

ردیف (ظ)

کیا قیامت ہی بتوں کی بزم میں جانے کا حظ
ہم کو خدمت کا اُنھوں کو کام فرمانے کا حظ

وصل میں بھی دردمندوں کو نہیں راحت نصیب
دیکھ لیجے شمع کے ملنے سے پروانے کا حظ

اس طرف گل ٹوٹتا ہی اُس طرف بلبل کا دل
کیا رہا گلچیں کے ہاتھوں باغ میں جانے کا حظ

جی نکلتا ہی میرا اس پر کہ کب آئے گا ہاتھ
یار کے پاؤں پہ سر کو رکھ کے مر جانے کا حظ

پوچھتا ہی خوب کیفیت نظارہ کی، یقیں
اُس نگاہِ مست سے لیتا ہی میخانے کا حظ

ردیف (ع)

دن جنوں کے آن پہنچے ہوشیاراں۔الوداع
فصل گل نزدیک آئی۔اے گریباں۔الوداع!

میکدہ سے قصد مکہ کا کیا ہے، کیا کریں
توبہ ہم سے ہو گئی اے می پرستاں۔الوداع

نہیں ہیں فرصت کہ اب کے سال باندھیں آشیاں
باغباں کا حکم یوں ہی، اے گلستاں، الوداع

ہم سے تھا ویرانہ تک آباد، سو ہم بھی چلے
اب خدا حافظ تمھارا، اے غزالاں، الوداع

ناتوانی سے اسے جور و جفا کی تاب نہیں
اب یقیں بوڑھا ہوا اے نوجواناں، الوداع

رشک تیری دلربائی کا زبس کھاتی ہی شمع
دیکھ تیرے حسن کے شعلہ کو جل جاتی ہی شمع

عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال ۔۔۔ کس قدر پہلوئے چرب اپنے سے دُکھاتی ہے شمع
بے حجابی بسکہ شانِ حسن کے لائق نہیں ۔۔۔ بزم میں فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع
اہلِ نور آہن دلوں سے بسکہ شرماتے ہیں سخت ۔۔۔ دیکھ کر گلگیر کی صورت کو کٹ جاتی ہے شمع

بادسے برہم نہیں ہوتا ہے یہ شعلہ یقیںؔ
بلکہ پروانہ کی گستاخی سے جھنجلاتی ہے شمع

ردیف (غ)

بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینے کا داغ ۔۔۔ ہوگیا ناسور آخر یار دیرینے کا داغ
موت کا مرہم خدا جانے کہ کب آوے گا ہاتھ ۔۔۔ کیونکہ جاوے جان تجھ بن ہائے اس جینے کا داغ
خاکساری محو کر ڈالے ہے سب دل کا غبار ۔۔۔ دور خاکستر سے ہی ہوتا ہے آئینے کا داغ
رشک کی جاتی نہیں میرے دلِ پرخوں سے خو ۔۔۔ جزو تن ہے مثل جرم لعل اس سینے کا داغ

گور میں جاوے گا خمخانہ کی حسرت لے یقیںؔ
لے گیا جمشید جوں عالم سے گنجینے کا داغ

ہم تو اب مرتے ہیں اور بجھتا ہے الفت کا چراغ ۔۔۔ دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ
آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب ۔۔۔ رات دن جلتا ہے یکساں داغِ حسرت کا چراغ
بے نگاہِ گرم رہتا ہے میرا باطن سیاہ ۔۔۔ حسن کا شعلہ ہے میرے دل کی خلوت کا چراغ
جائے کب میری یہ سرگرمی کسی کی سعی سے ۔۔۔ کب حسد کی باؤ سے بجھتا ہے دولت کا چراغ

خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقیںؔ
ہے میرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

ردیف (ف)

دل نہیں کھنچتا ہے بن مجنوں بیاباں کی طرف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف

فصلِ گل کی ہم اسیروں کو خبر کب ہے و لے
ان دنوں ہیں شور سا کچھ ہے گلستاں کی طرف

آگ سی مجھکو لگی ہے بیاس یہ کیونکر بجھے
کیونکہ دیکھوں سیر اس خورشیدِ تاباں کی طرف

اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف

سحر کے ڈورے جو سنتے تھے سو اب دیکھے یقیںؔ
دل کھنچا جاتا ہے اس زلفِ پریشاں کی طرف

آئینہ ہوتا ہے اس روئے درخشاں کا حریف
ماہ بن اور کون ہو خورشیدِ تاباں کا حریف

کون کر سکتا ہے پھر تسخیرِ ویرانہ کا ملک
جب ہو مجنوں سا کوئی تب ہو بیاباں کا حریف

عشق کے کعبہ کو جاتا ہے چلا یہ کارواں
ہو سکے کیونکر جرس دلہائے نالاں کا حریف

کون دے بن آہ میرے شورِ بلبل کا جواب
کون ہو جز سینۂ زخمی گلستاں کا حریف

سالہا سوزِ محبت کو چھپایا تھا۔ یقیںؔ
ہاتھ آخر ہو گیا میرے گریباں کا حریف

ناصح سے مجھکو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

رویا ہوں یہاں تلک کہ اب آنکھوں میں نم نہیں
بے آب ہو گئے گہرِ آبدار حیف

کوئی بلبل ان دنوں میں نہ پھنسیو چنانچہ میں
جب تک کہ چھوٹوں ہو گئی آخر بہار حیف

اس دکھ میں دیکھ مرگ بھی مجھ سے سرک گئی
کیا غم نے کر دیا مجھے زار و نزار حیف

جاتی نہیں وہ بے مزگی ہجر کی۔ یقیں
کچھ وصل کے نشہ نے نہ کھویا خمار حیف

ردیف (ق)

میرے خوں سے تو اندیشہ نہ کر اے بیوفا مطلق
کہ ہوتا نہیں ہے قتلِ عاشقاں میں خوں بہا مطلق

مجھے معذور رکھو ہمصفیروں نالہ کرنے سے
رہی نہیں اب زباں میری فغاں سے آشنا مطلق

ملوں کیونکر نہ ان شیریں لبوں سے میں کہ دوری سے
نہیں پایا مرا دل۔ زندگانی کا مزا مطلق

مرا ڈرتا ہے جی۔ آخر کو کیا ہوگا کئی دن سے
مرے بیمار دل کو نہیں اثر کرتی دوا مطلق

نہ رہ ہرگز مقید مہربانی کی توقع کا
یقیں اس قوم میں دیکھی نہیں ہم نے وفا مطلق

بہت جینے کی تدبیر اہلِ عرفاں کے نہیں لائق
کہ پینا آبِ حیواں شانِ انساں کے نہیں لائق

چمن میں دہر کے جی اس دلِ نالاں کا نہیں لگتا
یہ خوش آواز بلبل اس گلستاں کے نہیں لائق

عجب نہیں خوش نگاہاں کا۔ اگر دشوار ہو ملنا
ہر ایک کا صید ہو جانا غزالاں کے نہیں لائق

جفا کرنا سجن۔ اہلِ وفا سے کیا مناسب ہے
بھلوں سے بدسلوکی خوب رویاں کے نہیں لائق

جنوں کے ہاتھ سے محفوظ ایک دم رہ نہیں سکتا
رفو کرنا یقیںؔ، میرے گریباں کے نہیں لائق

ردیف (ک)

زباں اُس مو کمر کے وصف میں ہے گفتگو نازک
قلم میرے سخن کو چاہیے مانندِ مو، نازک

جو پیا ہے میرے دل کا لہو پی، لیکن آہستہ
خدا شاہد کہ شیشے سے ہے زیادہ یہ سبو، نازک

عرق کرتا ہے اپنے حسن کے شعلہ کی گرمی سے
پرے ہے گل سے بھی، یہ دلبرِ خورشید رو، نازک

لبوں پر زخم کے جی آرہا ہے مت نکل جاوے
خدا کے واسطے کیجو نہایت یہ رفو، نازک

اُن آنکھوں کی نگہ کا لطف پاتا ہے یقیںؔ مشکل
کسی کو کیونکہ سمجھا دیں کہ ہے نرگس کی بو، نازک

ردیف (گ)

اشک سے لاگی ہے پروانہ کے جیسی، تن کو آگ
لگیو اے فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ

جلتے بلتے سے نہ مل ان تیلیاں کپڑوں کے ساتھ
جی دھڑکتا ہے مبادا، لگ اُٹھے دامن کو آگ

دل ترے کو تازہ کرتا ہے ہمارا خونِ گرم
لال تر کرتی ہے جیسے پارۂ آہن کو آگ

فصلِ گل آتی ہے بلبل آشیاں کا کر علاج
لگ اُٹھے گی اب کوئی دن بیچ اس گلشن کو آگ

جل یقیںؔ بہتر نہیں ہے اس سے جل مرنے کی طرح
کیا ہی پھولا ہے پلاس اور لگ رہی ہے بن کو آگ

ردیف (ل)

تجھکو کب چھوڑے گا ان حسرت پناہوں کا وبال
ہوگیا یوسف کا دامنگیر چاہوں کا وبال

ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ ان دھواں دھاروں کے تئیں
خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال

ناصح اس دیوانہ آشفتہ مو سے مت اُلجھ
سر پہ کیوں لیتا ہی ناحق بے گناہوں کا وبال

اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے مت گزر
بے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال

بدگماں زاہد! یقیں سے پاکبازاں پر نہ رکھ
دیکھ کہیں سر پر پڑے گا بے گناہوں کا وبال

رات دن دل کو لگا رہتا ہی خوباں کا خیال
بلبلوں سے چھوٹتا کب ہے گلستاں کا خیال

اور کے منہ دیکھنے کی کب ہی ان آنکھوں کو تاب
سامنے ہو جن کے اس خورشید تاباں کا خیال

ہاتھ گر لگتا زنانِ مصر کو یہ آفتاب
خواب میں جاتا انھیں اس ماہ کنعاں کا خیال

سنبلستاں ہو رہا ہی آج اے ناصح دماغ
کیونکہ جاوے سر سے اس زلفِ پریشاں کا خیال

کیوں عبث سیتا ہی اے ناصح، یقیں کا چاک جیب
ہاتھ اس کا چھوڑتا کب ہی گریباں کا خیال

اگر ہوتی نہ کافر باغباں سے آشنا بلبل
تو اتنا گل کے نظارہ سے کیوں کرتی حیا بلبل

"چمن آباد ہو اور باغباں کا خانہ ویراں ہو"
چلی گلزار سے آخر کو یہ کر کر دعا بلبل

نہ گل دیکھا نہ نالہ ہمصفیروں کا سنا اس نے
قفس میں کیوں پھڑکتی ہی یہ بے برگ و نوا بلبل

زیارت باغ کی کرتی ہے آنسو سے وضو کر کے ‏ ‏ ‏ حباب گل میں رکھتی ہے عجب صدق و صفا بلبل

جفائیں باغبانوں کی یقیںؔ کیا کیا اٹھاتی ہے

وفا یوں چاہیئے! شاباش بلبل مرحبا بلبل!!

چمن میں مجھ سے دیوانے کے لیجانے سے کیا حاصل ‏ ‏ ‏ دکھا کر گل، جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل

جنھیں بالوں کی پھانسی دی ہے، وہ ہرگز جی نہیں سکتے ‏ ‏ ‏ جو زلفوں میں پھنسا دا، اس کے غم کھانے سے کیا حاصل

ہمارے درد کی دارو، اگر کچھ ہے، تو دارو ہے ‏ ‏ ‏ یہ تب سمجھے سن کے، ساقی، بات پی جانے سے کیا حاصل

نگہ تیرے ہے جیسے عکس آئینہ کا چینی میں ‏ ‏ ‏ یہ سب باتیں سمجھ کر جان، شرمانے سے کیا حاصل

نہ وہ دل ہے نہ وہ شور جنوں ہے، سیر گل مت کر

رفیقوں بن، یقیںؔ، گلزار میں جانے سے کیا حاصل

قد ترا، از بسکہ، رکھتا ہے لٹک جوں شاخ گل ‏ ‏ ‏ بلا کے چلنے سے جاتا ہے لہک جوں شاخ گل

ہوں جفا سے خوش کہ کرتی ہے تری شمشیر تیز ‏ ‏ ‏ نقش غم کو، صفحۂ خاطر سے حک جوں شاخ گل

ہار مت پہنا کر اے پیارے، کہ نازک قد ترا ‏ ‏ ‏ بوجھ سے پھولوں کے کھاتا ہے لچک جوں شاخ گل

دفن کیجیو مجھکو آہستہ، کہ میرے استخواں ‏ ‏ ‏ ہو رہے ہیں مارے زخموں کے تنک جوں شاخ گل

مر چکا ہوں تب سے جی میں مجھ دوانے کے، یقیںؔ

وہ حنائی ہاتھ جاتے ہیں کھٹک جوں شاخ گل

ردیف (م)

مے ہوئی آخر، رہی تدبیر غم کی نا تمام
کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا مینا تمام

آبرو دی ہے دوانوں نے جنوں کو اس قدر
گریۂ مجنوں سے دریا ہو گیا صحرا تمام

پاؤں سے سر تک پہنچتے مست ہوتی ہے نگاہ
ہے عروجِ نشّہ گویا وہ قدِ بالا تمام

انفعال و شرم کے مارے زمیں میں گڑ گیا
کوہکن کی نامرادی دیکھ کر خارا تمام

جب گیا ہے باغ میں خونی کفن ہو کر یقیںؔ
دیکھ اس کو مل گیا ہے خاک میں لالا تمام

پڑ گئی دل میں ترے تشریف فرمانے میں دھوم
باغ میں مچتی ہے جیسے فصلِ گل آنے میں دھوم

تیری آنکھوں نے نشہ میں اس طرح مارا ہے جوش
ڈالتے ہیں جس طرح بدمست میخانے میں دھوم

چاند کے پرتوے جوں پانی میں ہو جلوہ کا حشر
مُنہ ترے کے عکس نے ڈالی ہے پیمانے میں دھوم

ابر جیسے مست کو شورش میں لاوے دل کے بیچ
مچ گئی ایک بار ان بالوں کے کھل جانے میں دھوم

بوئے مے آتی ہے مُنہ سے جوں کلی سے بوئے گل
کیوں یقیںؔ سے جان کرتے ہو مُکر جانے میں دھوم

ردیف (ن)

مصر میں حسن کی وہ گرمیِ بازار کہاں
جنس تو ہے پہ زلیخا سا خریدار کہاں

فیض ہوتا ہی کہیں پہ۔ نہ مکاں پر نازل — ہے وہ ہی طور، وہی شعلۂ دیدار کہاں

عیش و راحت کے تلاشی ہیں یہ سارے بے درد — ایک ہم کو ہے یہ ہی فکر، کہ آزار کہاں

عشق اگر کیجئے دل کیجئے کس سے خالی — درد و غم کم نہیں اس دور میں غمخوار کہاں

قیدی اس سلسلۂ زلف کے، اب کم ہیں یقیں
ہیں دل آزار بہت، جان گرفتار کہاں

ہم تو حاضر ہیں، عشق یار کہاں — خار و خس جمع ہیں شرار کہاں

باغباں در نہ بند کر، کہ نفسِ دگر — ہم کہاں، تو کہاں، بہار کہاں

سایۂ تاک میں بڑا ہے زور — لیک وہ سایہ پائدار کہاں

ہم ہیں مختار، کہتے ہیں باتاں — جبر میں پھر یہ اختیار کہاں

موج میں آبِ زندگی کے یقیں
مزۂ تیغِ آب دار کہاں

عمر آخر ہے جنوں کر لوں بہاراں پھر کہاں — ہاتھ مت پکڑو مرا یارو، گریباں پھر کہاں

چشم تر پر گر نہیں کرتا، ہوا پر رحم کر — دے دے ساقی ہم کو مئے، یہ ابر باراں پھر کہاں

یار جب پہنے جواہر کر دے اے دل جی نثار — جل چک اے پروانے! یہ رنگیں چراغاں پھر کہاں

اس طرح صیاد کب آزاد چھوڑے گا تمھیں — بلبلو دھومیں مچالو، یہ گلستاں پھر کہاں

ہے بتوں میں یقیں سب کچھ ولیکن درد نہیں
بھر کے دل رو لیجئے، یہ چشم گریاں پھر کہاں

کیونکہ ہو شاداب روئے بن، محبت کا چمن — سبز، اشکِ سرخ سے ہوتا ہے، الفت کا چمن

گلشنِ حسنِ سپاہی کی جفا ہے آبیار — رنگ خونخواری سے پکڑے ہے شجاعت کا چمن

ہے امارت کس قدر بے رنگ، بے جود و سخا — بن ترشح کیونکہ ہو سرسبز، دولت کا چمن

ڈھب نہیں ہے خلق کی آنکھوں کو نظارہ کا ہائے — بھر رہا ہے رنگ سے جلوہ کے قدرت کا چمن

سیر میں نے کی بہت باغِ تمنا کی، یقیںؔ
گل نہیں رکھتا ہے غیر از داغ، حسرت کا چمن

بن چاک، سینہ بیچ محبت کی جا نہیں — جس گھر کا در کھلا نہیں، اس میں ہوا نہیں

کعبہ بھی میں گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق — اس درد کی، خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے — بیگانگی سے اُس کے کوئی آشنا نہیں

الفت میں کس امید سے کیجئے دماغ صرف — ان گلرخوں کی خاک میں بوئے وفا نہیں

شیریں دہن بھی، تلخ لگے بولنے، یقیںؔ
اب چھوڑ دے نظارہ، کچھ اس میں مزا نہیں

درد بن ہم کو، کچھ اس آگ سے مقصود نہیں — عشق پھیکا ہے اگر زخم، نمک سود نہیں

ہم سے گر سر نہ نوا، اہلِ تکبر کا تو کیا — فخرِ آدم ہے جو ابلیس کا مسجود نہیں

ہے اسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار — اور کسی طرح میرے زخم کا بہبود نہیں

بت پرستی میں موحد نہ سنا ہوگا کبھو — کوئی تجھ بن میرا واللہ کہ معبود نہیں

دیکھ کر مجھکو کسی آنکھ سے آنسو نہ گرا — ظاہرا، آتشِ سودا میں، یقیںؔ دود نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا، وفا نہیں — بندوں کو اعتراض خدا پہ بجا نہیں

ہر فصلِ گل زمینِ محبت میں ہے بہار — اس شہر سا جہاں میں کوئی خوش ہوا نہیں

ہے نور کے حجاب یہ اسبابِ دنیوی — ہر فرشِ آفتاب جہاں بوریا نہیں

کیوں چاہتے ہو میرے تپِ عشق کا زوال — یہ درد خود دوا ہے، اسے پھر دوا نہیں

جور و ستم کا ان سے تعجب نہ کر یقیں
یہ سنگدل بتاں ہیں، کچھ آخر خدا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں — اس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

کوئی شتاب خبر لو، کہ بے نمک ہے بہار — چمن کے بیچ دیوانوں کا اب کے شور نہیں

تجلّیوں سے پہنچتا ہے کب اُسے آسیب — صنم کدہ ہے نہ آخر، یہ کوہِ طور نہیں

ترے سفر کی خبر سُن کے، جان دھڑکوں سے — جو پہنچوں مر کے نزدیک میں، تو دور نہیں

کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل
یقیں میں غور سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں

تو نے ہم پر جو جفا کی ہے سو مذکور نہیں — تس پہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں

تجھ سے کیوں ہاتھ اُٹھاؤں گا، ترے ہاتھوں جان — جان سے عاشق اگر گزرے تو کچھ دور نہیں

تابداں ہو نہ اگر گھر میں، تو اندھیرا ہے وہ گھر — ہے وہ ظلمت کدہ، جس سینہ میں ناسور نہیں

سینہ میرے میں، ترے عشق سے ہے جوں شانِ عسل — کون ناسور ہے جو نیش سے معمور نہیں

دین و دنیا کے مجھے کام سے کھوتا ہے یقیں — چھوڑ دوں عشق، یہ باللہ کہ مقدور نہیں

تیغ میں آج بتاں کا کوئی دمساز نہیں — یہ خدا کا ہے غضب، دلبری و ناز نہیں

ہم گئے کام سے، مرغانِ چمن سے کہیو — قرض کیجے، کہ چھٹے، طاقتِ پرواز نہیں

تیری تصویر کوئی کیونکہ کھنچے تیری جگہ — کارِ استاد ہے یہ، حسنِ خداداد نہیں

خوش ہو کب نالۂ عشاق سے خوباں کا دماغ — رگِ بسمل کی صدا تار کی آواز نہیں

یار کے قد کو نہ دے سرو سے تشبیہ یقیں
سرکشی میں تو مسلّم، و لے طنّاز نہیں

یہ سینہ عشق سے محرومِ درد و داغ نہیں — ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

مت اختلاط کر، اے نوبہار، اب ہم سے — چمن کے ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

یہ بلبلوں کا، صبا، مشہدِ مقدس ہے — قدم سنبھال کے رکھیو، ترا یہ باغ نہیں

خدا کرے کہ یہ روشن رہے قیامت تک — چراغِ گور ہے، مستوں کا یہ ایاغ نہیں

گلی میں یار کی دل بھول جا پڑا تھا یقیں
پھر اُن دنوں سے دیوانہ کا کچھ سراغ نہیں

یہ ناخوشی سے بتاں کا مجھے خیال نہیں — مزاج دل کا مرے ان دنوں بحال نہیں

ہمیشہ مجھ سے نئی جان چاہتا ہے سجن — یہ کون ہٹ ہے، تو اتنا بھی خردسال نہیں

خدا کرے، نہ گروں عشق کی میں نظروں سے — کسو کی چشمِ حقارت سے کچھ ملال نہیں

اصولِ عشق پہ تولیں، تو زمزمہ اس کا — نہیں درست، جو بلبل شکستہ بال نہیں

یقیں، چمن میں کچھ اس کا سبب نہیں معلوم — کہ بلبلوں کا وہ ہنگامہ اب کے سال نہیں

بلائے عقل سے کچھ چھوٹنے کی راہ نہیں
بغیر میکدہ، یارو! کہیں پناہ نہیں

بتاں، خدا کی خدائی کے سب مظاہر ہیں
جو ان کا بندہ کہاوے، تو کچھ گناہ نہیں

نہ کر مضائقہ گر تجھکو ہے ستم کی ہوس
دیارِ عشق ہے، یہاں کوئی دادخواہ نہیں

خجل نہ کر مجھے، مہماں نہ ہو مرا اے عشق
کہ میرے آنکھیں میں آنسو، جگر میں آہ نہیں

جہاں کے بیچ کہیں آبرو نہیں اُس کو
یقیںؔ، جو حضرتِ خوباں کا خاک راہ نہیں

مجھکو اب سیر و تماشا سے تنا سائی نہیں
تجھ بن، اے نورِ بصر کچھ مجھ میں بینائی نہیں

شوق کہتا ہے پکڑ لوں دوڑ کر دامانِ یار
کیا کروں مستی سے کچھ ہاتھوں میں گیرائی نہیں

جس محبت میں نہیں ہے شور، ہے وہ بے نمک
کیا مزا ہے عشق بازی میں جو رسوائی نہیں

منفعل ہوں سخت جانی سے میں اپنی دل میں حیف
جس قدر تو سنگدل ہے اتنی میںنائی نہیں

بن **یقیںؔ** کے باغ میں جاکر بتاں کہتے ہیں سب
سیرِ گل میں جی نہیں لگتا، وہ سودائی نہیں

بھول جاتا باغ کے زیبا درِ گلستاں کی پھبن[1]
دیکھتا گر باغباں، زخمِ نمایاں کی پھبن

صدقہ جاتا ہے میرا دل بال بال اوپر تیرے
دیکھتا ہوں جب تری زلفِ پریشاں کی پھبن

ناصح! اس چاکِ گریباں پر تو کیجو اعتراض
دیکھ کر پہلے ٹک ایک ان جامہ زیباں کی پھبن

---

[1] بعض نسخوں میں پھبن کی جگہ "تبن" لکھا گیا ہے ۱۲

ہائے میرا ہاتھ مت پکڑو کہ جب گل کی طرح　　چاک ہی کرنے میں ہے میرے گریباں کی پھبن

ہے مسلم سرو کی بھی جامہ زیبی، پر یقیں
کچھ کہی جاتی نہیں اس سرو داماں کی پھبن

فیض میرے داغ سے ہے خورد سالوں کے تئیں　　جس طرح خورشید نافع ہے نہالوں کے تئیں

مت بھرا ان اشکِ خوں کو، آنسوؤں سے غیر کے　　مت لڑا لڑکوں کی طرح، اے شوخ، ان لالوں کے تئیں

ادھ موؤں پر ظلم کرنا، رحم کا کرنا ہے کام　　زندگانی مرگ ہے ان جینے والوں کے تئیں

سر نہیں دل کے ملاتے، ہائے یہ مطرب پسر　　بھول جانا چاہیے ان کے خیالوں کے تئیں

جب سے اس جنگل کو لیلیٰ کر گئی وحشت یقیں
پھر نہ جمعیت سے دیکھا ان غزالوں کے تئیں

کم نہیں ہم پوجتے کعبہ سے میخانے کے تئیں　　سجدہ ہم کرتے ہیں جوں محراب پیمانے کے تئیں

ہے یہ دل، ناصح، بتاں کا جلوہ گاہ اس سے نہ بول　　توڑ مت سنگِ جفا سے اس پری خانے کے تئیں

ہجر میں جینے سے بہتر ہے ہلاکِ روزِ وصل　　یہ طرح کیا خوب راس آئی ہے پروانے کے تئیں

لائے مے کرتی ہے تعمیر دلہائے خراب　　تا ابد رکھیو خدا، معمور میخانے کے تئیں

اٹھ گیا مت کہتے ہیں دیوانہ یقیں دنیا سے ہائے
اُن نے کیا آباد کر رکھا تھا ویرانے کے تئیں

کروں کیونکر میں قیدِ زلف سے چھٹنے کی تدبیریں　　پڑی ہیں میری ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں

تماشا کر تصور کو کہ ہر اک اشک میں میرے　　تری صورت نظر آتی ہے جوں شیشہ میں تصویریں

ہمیں بھی بات کہہ آتی ہے لیکن دل نہیں حاضر
حیا سے دور ہے ناصح خموشاں ساتھ تقریریں

دلوں پر برق سی گرتی تھی جب ہم نالہ کرتے تھے
گئیں کیدھر نہیں معلوم ان آہوں کی تاثیریں

یقیںؔ اقبال ہاتھ آتا نہیں کچھ جی کے دینے سے
نہیں ہونے کے ہم فرہاد گر سو بار سر چیریں

کرتا ہے کوئی یارو اس وقت میں تدبیریں
مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

مارے ہیں تباں ٹھوکر گر پاؤں پہ سر رکھیے
ہیں بندگیاں ان کے آئین میں تقصیریں

اس عشق کے کشور میں یکساں ہے حق و باطل
پرویز کو دیں افسر فرہاد کا سر چیریں

ناداں ہیں جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاویں
لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں

چہرہ سے نکل کر مو پڑتے ہیں یقیںؔ منہ پر
اوراقِ طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں

نہ گزرا ہوگا کوئی مجھ سا رنگیں باولے پن میں
گریباں آ پڑا ہے پھٹ کے گل کی طرح دامن میں

پڑی کہتی تھی یوں بلبل بہار آوے بہار آوے
پڑا جی اب لگی جب رنگِ گل سے آگ گلشن میں

اگر رستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے
کہ اس کا جی نکل جاوے گا اس کی ایک ٹھنگن میں

کوئی گلچہرہ خوش آہنگ اس گلشن سے گزرا ہے
کہ ادھر ہی دھن ہے مرغانِ چمن کی آج شیون میں

یقیںؔ سے چلتے چلتے کی خبر کیا پوچھ کر لوگے
پڑا ہوگا دیوانہ باولا سا کنج گلخن میں

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھکو بہاراں میں
عبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں

ہمیں رخصت کر اب اے باغباں گو بیوفائی ہے
خزاں سے جی نہیں لگتا ہمارا اس گلستاں میں

چمن کے بیچ کلیاں تو ہیں جیسے شاخ سنبل کی
ہوئے ہیں اس قدر دل جمع اس زلفِ پریشاں میں

جنوں کی مے سیں کب سر نہ میرا گرم ہو ناصح
لگی ہے آگ رنگِ لالہ سے کوہ بیاباں میں

قیامت تک الٰہی زندہ رکھیو نام مجنوں کا
یقیںؔ کو دیکھ کر کیا جی سا آتا ہے غزالاں میں

جب دیکھتا ہوں تنہا تجھکو سجن، چمن میں
کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں

رڑکے کھڑے ہیں غمگیں تھرے پڑے ہیں بیکس
دیوانہ ہاے جب سے جاتا رہا ہے بن میں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دیوانہ پن میں

اس داغدار دل کو گاڑو نہ ساتھ میرے
ڈرتا ہوں مت لگے اٹھ آتش مرے کفن میں

خوباں یقیںؔ کو معذور اب تو رکھو کہ اس کے
لوہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نین میں

بہار آئی ہے ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں دیکھیں

اٹھا اس منھ سے اے بادِ صبا گھونگٹ کے آنچل کو
توجہ سے تری ہم بھی ٹک ایک گلستاں دیکھیں

ہر ایک نے راہ میں اس کی کیا ہے چشم کو گریاں
کرے کس آب جو پر رحم وہ سرو رواں دیکھیں

پکاریں ان کو آؤ اپنے باغوں کی خبر پوچھیں
اسی گلشن سے آتی ہیں چلی یہ بلبلاں دیکھیں

یقیںؔ کے سر کو ٹھکرا کر بتاں آپس میں کہتے ہیں
جئے گا کب تلک ان طور سے ایسا ناتواں دیکھیں

گالی بھی پی گئے ہیں، ماریں بھی کھائیاں ہیں
ہم نے تیری جفائیں کیا کیا اٹھائیاں ہیں

خسرو کے منہ پہ چڑھنا اور بیستوں سے بھڑنا
کچھ عاشقی نہیں یہ، زور آزمائیاں ہیں

ہم تو چلے ہیں، یارب، آباد رکھیو ان کو
ان بانچوں میں کیا کیا دھومیں مچائیاں ہیں

ایسا دراز دامن، نہیں ہاتھ ان کے آتا
بختوں میں عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں

حق کو یقیں کے یارو، برباد مت دو آخر
تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں

دیوانہ مجھ سا کب جیتا ہے، کیوں تدبیر کرتے ہیں
کوئی دن چلنے پھرنے دیں، عبث زنجیر کرتے ہیں

ہوائے گرم کے لگنے سے کب پتھر پگلتا ہے
یہ نالے ان بتوں کے دل میں کب تاثیر کرتے ہیں

خدا کی بندگی کہیئے اسے، یا عشق معشوقی
یہ نسبت ایک ہے، سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

دیوانے ہیں یہ سیانے، چھوڑ دو تم نقش کو ان کے
پرائے گھر کی پریوں کے تئیں تسخیر کرتے ہیں

نگہ کرنے میں ان کے، کام ہوتا ہے تمام اس کا
یقیں کے حق میں یہ خوباں بہت تقصیر کرتے ہیں

کیا فرہاد نے جو کچھ، محبت اس کو کہتے ہیں
دیا جی بات کے کہنے میں، ہمت اس کو کہتے ہیں

نہ کی تو نے نظر اس کی محبت پر نہ محنت پر
ارے فرہاد کے قاتل، عدالت اس کو کہتے ہیں؟

مئے گلرنگ جوں شیشہ سے چھلکے، معنی شوخی
نمایاں تیری صورت سے ہے، صورت اس کو کہتے ہیں

چمن میں شاخ ہل جاتی ہے جیسے گل کے کھلنے سے
لمک جاتا ہے دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں

یقیں، اس تیری بدخوابی کا یہ نظارہ عبث ہے
سبھوں سے موند لے آنکھیں کہ رحلت اس کو کہتے ہیں

دوبارہ زندگی کرنا، مصیبت اس کو کہتے ہیں | پھر اٹھنا بے دماغوں کا، قیامت اس کو کہتے ہیں
ہوئی جا، یار شیریں کوہکن کے بعد خسرو کی | وہ کیا تھا زخم تیشہ کا، جراحت اس کو کہتے ہیں
مرے گرباں و پر ٹوٹے قفس میں کیا ہوا لیکن | گیا وہ ذوقِ سیرِ گل؟ جبارت اس کو کہتے ہیں
بمقدار جفائے یار، بڑھتی ہے وفا میری | کوئی چاہے تو آ دیکھے، محبت اس کو کہتے ہیں

یقیں مارا گیا جرمِ محبت پر، زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں، سعادت اس کو کہتے ہیں

ردیف (و)

نہیں ہوں منکرِ، اہلِ میخانے سے کہہ دیجو | نہیں کی جی سے میں نے توبہ پیمانے سے کہہ دیجو
جو کرنا ہے تو اپنی فکر کر لے، نوبہار آئی | خدا کے واسطے یہ بات دیوانے سے کہہ دیجو
کوئی یہ چاند سا منہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا | گزر آتش پرستی سے، یہ پروانے سے کہہ دیجو
رکھا ہے گھیر، ان شہری غزالوں نے مرے دل کو | پھنسا ہوں اب تو بستی میں، یہ ویرانے سے کہہ دیجو

کیا سجدہ یقیں نے، دیکھ اس محرابِ ابرو کو
برہمن تو رہا مسجد میں، بت خانے سے کہہ دیجو

اسیرانِ قفس کی ناامیدی پر نظر کیجو | بہار آوے تو اے صیاد، مت ہم کو خبر کیجو
کیا ہے عشق ہم نے، تجھ سے ہمدم کے بھروسے پہ | خدا کے واسطے، اے آہ، اس دل میں اثر کیجو
نہ کر شوخی، مبادا تاب کھا جائے کمر تیری | ٹک اس قد کی نزاکت پر نظر، اے موکمر کیجو

کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے، جو تو کہہ سکے کہیو — میری اس بے زبانی پر نظر، اے نامہ بر! کیجو

یقیں سے جلتے بلتے کا سر اتنا بھی نہ ٹھکراؤ
اس آتش سے ارے دامن دراز دوں، ٹک حذر کیجو

قامتِ رعنا سے تیرے بسکہ شرماتا ہے سرو — دیکھکر تجھکو زمیں کے بیچ گڑ جاتا ہے سرو

تم ہمیں پامال یوں کرتے ہو، اے خوش قامتوں — دیکھتے ہو، قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

قمریوں میں ذکر تیرے قد کا جب ہوتا ہے گرم — ریجھ کر جوں نخلِ آتش رقص میں آتا ہے سرو

باد سے ہلتا نہیں ہے، بلکہ تیری چال دیکھ — بسکہ چل سکتا نہیں خفت سے اکلاتا ہے سرو

باغ میں جب یار جاتا ہے یقیں سایہ کی طرح
اس قدِ سرکش کے آگے فرش ہو جاتا ہے سرو

جفا کے عذر میں، اے ظالموں، نہ دیر کرو — میری زباں کو شکایت پہ مت دلیر کرو

حنا کی طرح میں اپنا بحل کیا ہوں، خوں — تباں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

چھپا نہیں میرا اسلام اور تمھارا کفر — فرنگ چشم کا خوباں مجھے اسیر کرو

کہاں تلک کوئی تنہا کیا کرے فریاد — اے بلبلوں، مجھے اپنا ہی ہمصفیر کرو

خدا کرے کہ کہیں حق شتاب ثابت ہو
مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

خونِ انصاف سے اتنی بھی زباں تر نہ کرو — لعل کو یار کے ہونٹوں کے برابر نہ کرو

اس رخِ صاف کے آگے نہ رکھو آئینہ — میں مکدر ہوں مجھے اور مکدر نہ کرو

جی نکل جائے گا عشاق کا بسمل کی طرح   گلرخاں، جامۂ رنگیں کو معطر نہ کرو

باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں، غیر کا قتل   اپنے بیداد کے مضموں کو مکرر نہ کرو

سایۂ بے شخص ٹھہرتا نہیں کہتا ہے **یقیں**

آپ سے مجھکو جدا حضرتِ مظہر نہ کرو

گرہ کھولو نہ زلفِ یار کی، شانے کو مت چھیڑو   چھوو مت دل کی زنجیر ایسے دیوانے کو مت چھیڑو

کوئی ترکِ ادب کرتا ہے معبودوں کی خدمت میں   مسلمانوں، خدا سے ڈر کے بت خانے کو مت چھیڑو

یہ محرابِ نمازِ بے خودی ہے، زاہدو، سمجھو   خدا کے واسطے، مستوں کے پیمانے کو مت چھیڑو

ابھی جاتا ہے جل، ایک دم تو جینے دو بچارے کو   ٹک ایک روشن کرو مت شمع پروانے کو مت چھیڑو

ستاؤ مت **یقیں** کے دل کو، یہ خوباں کا مسکن ہے

خدا جانے کہ کیا ہو، اس پری خانے کو مت چھیڑو

قفس کے بیچ پھنسنے کا نہیں دیوانہ پن مجھکو   نہ دو تکلیفِ شور اے عندلیبانِ چمن مجھکو

محبت کا مزا بگڑا نہیں گر اس زمانہ میں   جوابِ تلخ کیوں دیتے ہو، اے شیریں دہن مجھکو

نہیں کھلتا ہے تجھ بن غنچۂ دل سیرِ گلشن سے   خس و خاشاک سے لگتے ہیں یہ سرو و سمن مجھکو

کوئی مجھ سے نہ بولو، میں تو اب مرنے کو بیٹھا ہوں   خلافت دے گیا ہے خود کشی کی کوہکن مجھکو

یقیں کے ساتھ اتنی بدگمانی، کیا قیامت ہے

اجازت عرض کی تو کیوں نہیں دیتا سجن مجھکو

کھڑا ہے سرو دیکھ بن بنا کے رعنا ہو   جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو

نہ لانا تھا میرے گریہ کو شور پر اے عشق　　بُری بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو

یہ آرزو ہے مجھے دورِ چرخ سے پسِ مرگ　　کہ میری خاک خُمِ مے و جامِ صہبا ہو

وہ ناخنِ ابروئے خوباں سے خوش نما تر ہے　　کسو کے کام کی جس سے کوئی گرہ وا ہو

لہو یقیںؔ کا جو پیتا ہے تو، میں ڈرتا ہوں

خدا کرے کہ تجھے یہ غذا گوارا ہو

شہر میں تھا نہ ترے حسن کا یہ شور کبھو　　مصر اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو

عشق میں داد نہ چاہو کہ سنا ہم نے نہیں　　عدل و انصاف کا اس ملک میں دستور کبھو

فکر ہم کا میرے واسطے مت کر، ناصح　　خوب ہوتا نہیں، اس عشق کا ناسور کبھو

گو نہ کر وعدہ وفا، دے مجھے اس کا تو جواب　　مجھ سے ملنا بھی سجن ہے تجھے منظور کبھو

اپنی بیدردی کی سوگند ہے تجھکو اے مرگ

تو نے دیکھا ہے یقیںؔ سا کوئی رنجور کبھو

جو تو شراب پئے کیونکہ دل کباب نہ ہو　　لگے جب آگ کہاں تک یہ زہرہ آب نہ ہو

تنک گزرتے ہیں ایّامِ عشق فراغ بغیر　　کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو

دیوانے شہر سے یہاں آکے چین پاتے ہیں　　خدا کرے، یہ خرابہ کبھو خراب نہ ہو

بتوں کی طرح نہیں، حسنِ خُلق و دامنِ پاک　　وہ کیا مزا ہے جو معشوق بد شراب نہ ہو

یقیںؔ بتوں کا ہوا بندہ جب سے ہے پُر داغ

جو ہووے کافر اُسے کس طرح عذاب نہ ہو

ردیف (ہ)

لے کے دل کرتے ہو ثابت دُکھ کے ماروں کا گناہ — جان و دل دینے میں کیا ہے ان بچاروں کا گناہ

اب تو ٹھیری ہے محبت جرم، پر آخر کے تئیں — سخت یاد آوے گا پیارے، جاں نثاروں کا گناہ

جو نہ جی سکتے تھے بیتابی سے، وہ پھر کیا کریں — جی نکل جانے میں کیا ہے بے قراروں کا گناہ

جو نہ گزریں خوں کے دعوے سے میں اپنے کیا کروں — کون کر سکتا ہے ثابت ان پیاروں کا گناہ

عاشقوں پر جبر کرتے ہیں یقیں یہ خوب رُو
کچھ نہیں واللہ، ان بے اختیاروں کا گناہ

ضبط بہتر ہے میسر گر نہ ہوتا ثیرِ آہ — یوں تو کرتا ہے جرس کا دل بھی نالہ سر براہ

اُس رخِ تاباں کے ایدھر خط اُدھر ہوا ہے سر — جوں سنہری آئینہ کے گرد تحریرِ سیاہ

ہو رہا ہے دل مرا بے ربط منصوبوں میں بند — جس طرح شطرنج کے پیادوں میں گھر جاتا ہے شاہ

عشق کے بھی کارخانے کی عدالت دیکھ لی — بوالہوس جیویں، مریں ہم، اے محبت واہ واہ

کیونکہ نکلے بزمِ خوباں سے کوئی جیتا یقیں
بے محابا کھنچ رہی ہے ہر طرف تیغِ نگاہ

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھکو بیخوابی کے ساتھ — جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بیتابی کے ساتھ

کر دیا آنکھوں کے رونے نے مرے دل کو خنک — کب تلک گرمی کرے آتش مردم آبی کے ساتھ

غنچہ، رنگینی کو اپنی چاہیے، تہ کر رکھے — اُس کو کیا نسبت ہے اُن لبہائے عنابی کے ساتھ

پونچھتے اُس مُنہ کے ہوجاتا ہی سب رنگیں رومال — گل کہاں ہوتا ہی ایسے رنگ و شادابی کے ساتھ

مفت نہیں لیتے وفا کو شہرِ خوباں میں یقیںؔ
کس قدر بے قدر ہی یہ جنس نایابی کے ساتھ

کہاں تک تیری نالہ ہیں اے مرغِ قفس چپ رہ — عبث صیاد کو ناخوش بھی کیوں کرتا ہی بس چپ رہ

کوئی آوارگی کو چھوڑ کیونکر راہ پر آوے — عبث تو شور و شر کرتا ہی اتنا اے جرس چپ رہ

گیا ہوگا نہ تو کیا یار کی گلیوں میں راتوں کو — نئی تقصیر میں نے ہی نہیں کی اے عسس چپ رہ

کسو کا دستِ کوتاہ اُس کے دامن تک کہاں پہنچے — تمنا کی زباں مت کر دراز اے بوالہوس چپ رہ

یقیںؔ یہ نالہ تیرا کیا بلا لاوے گا ڈرتا ہوں
لگا مت گھر کو اپنے آگ اے آتش نفس چپ رہ

بہار آئی ہمیں کیا حکم ہے اے باغباں سچ کہہ — چمن میں رہنے پاویگا ہمارا آشیاں سچ کہہ

یہ آدھی رات ہے اور تیشہ رہے ساتھ ہی تیرے — خدا حافظ ترا اے جان جاتا ہی کہاں سچ کہہ

ہزاروں آبجو آنسو کے یہ تیرے ساتھ پھرتے ہیں — تو کس گلزار کا ہی سرو اے رعنا جواں سچ کہہ

نمک ڈالا ہی مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے — کہیں کھائے ہیں تونے اس مرے کے استخواں سچ کہہ

یقیںؔ راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہی
یہ کس بیداد سے سیکھا ہی فریاد و فغاں سچ کہہ

بُت کرے سجدہ ترے حسنِ خدا داد کو دیکھ — سرو بندہ ہو ترے قامتِ آزاد کو دیکھ

اُن گنہگاروں میں ہوں میں کہ مرنے کے مارے — جی نکلتا ہی مرا دور سے جلاد کو دیکھ

عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے — آ تو اے چرخ ٹک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

حسن گل کا تو مسلّم ہے، ولیکن بلبل — عشق گر تجھ کو ہے منظور، تو صیاد کو دیکھ

عشق کے جور و ستم میں تجھے گر شک ہے یقیں

حسرت — عیشِ پرویز کو اور محنتِ فرہاد کو دیکھ

منہ اپنا نہ دکھا کر، ہو جائے گا دیوانہ — آئینہ کو کہتے ہیں اے شوخ، پری خانہ

کیا دھوم مچائی ہے صحرا میں دیوانوں نے — اس فصلِ مبارک میں آباد ہے ویرانہ

دل، داغِ محبت بن، کچھ کام نہیں آتا — ہے جوں ورقِ باطل، بے مہر یہ پروانہ

کچھ عمر نہیں باقی، ساقی تو شتاب آ جا — ڈرتا ہوں چھلک جاوے، لبریز ہے پیمانہ

منہ پھیر نہ نالہ سے آنسو سے نہ موڑ آنکھیں

موج — اتنا بھی یقیں مت ہو اپنوں ستی بیگانہ

زاہد جو نہ ہم ہوتے، یہ دیر تھا ویرانہ — ہے شور سے مستوں کے آباد یہ میخانہ

منہ اپنے کے گلشن میں اُٹھنے نہ دیا کر خط — یہ سبزہ ترے خط کا، ہے سبزۂ بیگانہ

ہوں ورد یہ جی میرا، راتوں کو ترے گھر پہ — پھرتا ہے پڑا جیسے فانوس پہ پروانہ

مجنوں نے جو یہ دھومیں دوری ہیں مچائی ہیں — ہے نشہ، تو آ جاوے، یہ دشت یہ ویرانہ

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے

کچھ خوب نہیں سننا، افسوں ہے یہ افسانہ

ردیف (ی)

زلیخا یار کو پہلے مزوں سے آشنا کرتی
پھر اس سے سو طرح پر اپنی حاجت کو روا کرتی

ملے جس کو ہمیں سا رقیب اُس کا خدا حافظ
زلیخا قید گر کرتی نہ یوسف کو تو کیا کرتی

دل آزاری جلائے حُسن ہے، یہ بات گر سنتی
غبارِ خاطرِ مجنوں کو لیلے طوطیا کرتی

موئے ہم فصلِ گل آنے سے آگے ہی خدا جانے
کہ کیا کیا شوخیاں ہم ساتھ یہ ظالم ہوا کرتی

یقیںؔ، فرہاد کو دُکھ ہی چھڑانا اُس کو لازم تھا
زبانِ تیشہ، خسرو کو قیامت تک دعا کرتی

بہار آئی ہے، کیا کیا چاک، جیب پیرہن کرتے
جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب، تو کیا دیوانہ پن کرتے

تصور اس دہانِ تنگ کا رخصت نہیں دیتا
جو ٹک دم مار سکتے ہم، تو کچھ فکرِ سخن کرتے

نہیں جز بخیۂ گل کچھ بھی ان ہاتھوں میں گیرائی
وگرنہ، یہ گریباں، نذرِ خوبانِ چمن کرتے

مسافر ہو کے آئے ہیں جہاں میں، تس پہ وحشت ہے
قیامت تھی اگر ہم اس خرابہ میں وطن کرتے

کوئی فرہاد جیسے بے زباں کو قتل کرتا ہے
یقیںؔ، ہم واں اگر ہوتے، تو ایک و دو بچن کرتے

چھُٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے، ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہنچے

ہمیں اس غم کے ہاتھوں زندگانی خوش نہیں آئی
کوئی بیداد گر، یارب، ہماری داد کو پہنچے

بہار آئی ہے جب سے، تب سے رگ میں تھم نہیں سکتا
دعا اس مشت خوں کی نشترِ فصّاد کو پہنچے

یقیںؔ تقلید میں سر مت پٹک تھریّا آ بس کر
یہ ممکن ہی نہیں، ہر سر جرا فرہاد کو پہنچے

ارے صیّاد اس بیداد پر بیداد کیا کیجے
شکارِ ناتواں مجھ سے کے تئیں آزاد کیا کیجے

اُٹھانے کا نہیں ہیں ہاتھ جوں گُل اس گریباں سے
اگر بو کی طرح جاوے گا جی برباد کیا کیجے

بہار آئی ہے اور ہم گلستاں میں جا نہیں سکتے
خدا کے واسطے تو ہی کہہ اے صیّاد کیا کیجے

ٹلا گر بیستوں تو کیا ہوا خسرو نہیں ٹلتا
بڑا پتھر ہے چھاتی پر ترے فرہاد کیا کیجے

جفا پر دلبروں کے صبر کرنا ہی مناسب ہے
یقیںؔ دعویٰ وفا کا کر کے اب فریاد کیا کیجے

اس سمن پوش سے آغوش رنگیں کیجے
جی میں ہے اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجے

دلبروں کو شاد رکھنا اس کا جب منظور نہیں
دل کو اُن کے واسطے کیوں مفت غمگیں کیجے

عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جوں کوہکن
جانِ شیریں دیجئے تب خوابِ شیریں کیجئے

ایک دم میں بلبلا سا پھوٹ جاتا ہے یہ دل
کچھ تو لازم ہے کہ اس شیشہ کو سنگیں کیجئے

یوں دیا، خوباں کی خاطر خانماں اپنا بہا
ایسی آنکھوں پر یقیںؔ کیونکر نہ تحسین کیجئے

ہوا میں سرو کے، اتنا نہ کر شور و شر اے قمری
نہ دے برباد تو اپنی کفِ خاکستر اے قمری

نہ بجھنے دیجو اس کو گرم رکھیو آہ و نالہ سے
یہ دل ہے مشتِ خاکستر کا تیری اخگر اے قمری

کسو دن دار پر کھینچیگی تجھکو سرو کی الفت	مناسب نہیں نہ جایا کر چمن میں اکثر اے قمری
نہیں تو تھامتی اس شعلۂ آواز کو اپنے	کہیں جل جائینگے ناحق ترے بال و پر اے قمری

یقیں کیجو کہ شوخی خوب نہیں خوباں کی خدمت میں
تو بیجا سرو کے چڑھ بیٹھتی ہے سر پر اے قمری

آئینہ عاشق کو خوباں کے مقابل کیا کرے	آپ حیراں ہے کسی کی حلِ مشکل کیا کرے
جس کو مرنے کی ہوس ہو اس کو جینا ہے وبال	زخم جب کاری نہ ہو پھڑکے نہ بسمل کیا کرے
ناصح اس کی سوزنِ مژگاں سے کھینچوں کیونکہ ہاتھ	زخم کو ٹانکے نہ دے اپنے تو گھائل کیا کرے
بے قراری کب ٹھہرنے دے ہے مجھکو زیرِ تیغ	مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیں
جب ہو استعداد ناقص پیرِ کامل کیا کرے

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے	اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور	آیندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے
جو کوئی عرض حال کرے تجھ سستی مرا	اول بیانِ واقعۂ کربلا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے	زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ہوتا ہے خاکِ راہِ وفا بیگماں یقیں
ہے دل میں یہ کہ شرطِ محبت ادا کرے

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے	بندگی کی جس نے خو کی وہ خدائی کیا کرے

مارے ہی جاتے ہیں آخر کوہکن سے سر پھرے ۔۔۔ خسرو بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے

ایک پل بھی نہیں ٹھہرتا ہائے یہ آنسو کی طرح ۔۔۔ اس دلِ بیتاب کی کوئی تسلی کیا کرے

چاہنے والے کے مرنے کو کوئی چاہے ہے کب ۔۔۔ عشق ہی دشمن ہو مجنوں کا تو لیلیٰ کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھکو ضعف آتا ہے یقیں
دیکھئے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے ۔۔۔ یہ خارِ خشک تلک ایک آگ سے بہار کرے

قیامت آپ یہ اس قد سے لا چکے ہم تو ۔۔۔ کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

جو تجھ میں درد ہو ناصح تو میری خواری سے ۔۔۔ نہ ننگ و عار کرے بلکہ افتخار کرے

ہمیشہ تشنہ ترے آبِ تیغ کا ہوں لیک ۔۔۔ کہاں وہ سیل مری خاک پر گزار کرے

اجل نہ چھوڑے گی آخر یقیں کو لازم ہے
کہ اپنے سر کو ترے پاؤں پہ نثار کرے

حیا و شرم سے کیوں کر کوئی حذر نہ کرے[۱] ۔۔۔ ادب سے تجھ پہ کوئی کب تلک نظر نہ کرے

جو یار غیر کے ساتھ اس طرف سے ہو گزرے ۔۔۔ خدا کے واسطے کوئی مجھے خبر نہ کرے

نگاہِ گرم سے کھاتا ہے تاب مو کی طرح ۔۔۔ خدا کسو کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے

ذرا نہیں ہے میری آہ میں اثر افسوس ۔۔۔ کسی چمن میں خدا شجر بے ثمر نہ کرے

رقیب غالب و دیوانہ دل غیور یقیں ۔۔۔ گلی سے یار کی کیوں کر کوئی حذر کرے

---

[۱] ایک نسخہ میں مقطع اس طرح ہے:
یقیں ہم آگ سے پتھر کا کچھ نہیں چلتا ۔۔۔ کہاں تلک ترے دل میں فغاں اثر نہ کرے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں، خدا نہ کرے
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا — کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے
ہے وہ مقتول، کافر نعمت — اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے
رو مرے کو، خدا قیامت تک — پشت پا سے تری جدا نہ کرے
ناصحو، یہ بھی کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

مجھکو تجھ بن دل سے کیا مطلب ہے، جیوے یا مرے — اختیار اس کا ہے، اس کے جی میں آوے سو کرے
یار گر منظور ہے، دنیا و عقبیٰ سے گزر — منزل مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے
مجھ سے ہو جاتا ہے دشمن، دیکھتے ہی دوست کو — اس طرح کے بے مروت دل سے کوئی کیا کرے
میرے رونے نے ترا خط کر دیا جلدی سے سبز — کھیت ہو جاتے ہیں جیسے مینھ برسنے سے ہرے
اس طرح رونے میں آنکھوں کا خدا حافظ یقیں
دیکھئے یہ خانماں اس رو میں ڈوبے یا ترے

ترا خورشید سا منہ دیکھکر پھولوں کی جاں لرزے — ترے قد کی نزاکت دیکھ سرو گلستاں لرزے
ترے خیمے ہی بادتند کے چلنے سے ہلتے ہیں — مرا نالہ اگر شوخی پہ آوے آسماں لرزے
نگہ چبھتی ہے دُگنی بھوں تھرکنے میں کرہت ہے — وگرنہ تیر لگتا ہے پریشاں گر کماں لرزے
وہ بلبل کیونکہ ہووے خار و خس سے مختلط جس کا — نسیم گل سے مارے نازکی کے آشیاں لرزے
نہیں کہہ بات سکتی شمع، پروانے کے ماتم میں — یقیں، بر جا ہے رونے میں کسو کی گر زباں لرزے

نہ مٹھا کوہکن کا نقش کچھ اس رنج و محنت سے
اُٹھا سکتا نہیں تیشہ سر اپنا اِن خجالت سے

دلِ روشن کے تئیں کب لگتی ہے ظلمت نظارہ کی
صفا میں آئینہ کے کب خلل آتا ہے کدورت سے

رفیقانِ موافق ساتھ زنداں بھی گلستاں ہے
ہوا ہے دام ہم کو آشیاں آپس کی الفت سے

شرابِ تلخ کی لذت کو پوچھے مے پرستوں سے
کوئی نعمت گوارا تر نہیں ہم کو مصیبت سے

زمانہ میں جو عاشق ہیں مناتے ہیں جینے کی
ہمارا جی نکلتا ہے یقیںؔ مرنے کی حسرت سے

جو سر پاؤں پہ رکھدیجے تو خوش ہو دیں تماں ہم سے
ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

تمھارے بال و پر سے باغ کی آتی ہے بو ہم کو
کبھو تو ملتے جایا کیجیے اے بلبلاں ہم سے

کوئی ان بلبلانِ باغ سے یہ پوچھے ہم کو
کہ جو آباد ہے گلزار خوش ہے باغباں ہم سے

جو چھپ کر دیکھتے گل کو تو کب صیاد واقف تھا
ہمارے آہ و نالہ نے چھڑایا آشیاں ہم سے

یقیںؔ کچھ دام میں پھنسنے کا اندیشہ نہیں مجھکو
پر اتنا ہے کہ تک آباد تھا یہ گلستاں ہم سے

خوش آئی ہے مجھے یہ بات اک مجنونِ عریاں سے
کیا کیجے کہاں تک چاک گزرے ہم گریباں سے

اگر برباد جاوے خاک میری کیا تعجب ہے
فلک جب صبح میں آتا ہے تیرے دورِ داماں سے

نہ ڈالو مجھ پہ اے مرغانِ آزاد اپنے سایہ کو
گرفتارِ وفا کو کام اب کیا ہے گلستاں سے

خبر میں ہائے لے سکتا نہیں اپنے بیاباں کی
نہیں ہے مجھکو چھوٹا ایک آن ان شہرِ غزالاں سے

گل و بلبل کی صحبت کیا نہیں دیکھی یقیںؔ تو نے
جو امیدِ وفا رکھتا ہے تو ان خوبرویاں سے

دیوانے کس طرح ناصح اٹھائیں ہاتھ طفلاں سے　　کہ ہے کشتِ جنوں سیراب ان کے سنگِ باراں سے

دکھا تھا ایک دن وہ پائے رنگیں میری چھاتی پر　　سو اب تک بوئے گل آتی ہے اس چاکِ گریباں سے

بتوں کی سج نے دیوانہ کیا ہے ہم کو محشر میں　　گریباں کا ہم اپنے خون لیں گے ان کے داماں سے

یہ پوچھو تو کہ کیا یہ سرزمیں مجنوں کا مدفن ہے　　چلی آتی ہیں شور انگیز بادیں اس بیاباں سے

ہمیں رخصت نہ ہو، گھنگرو بتوں کے پاؤں کو چومیں
یقیں یہ لوگ کیا ڈرتے نہیں دلہائے نالاں سے

تمہیں ہے جامِ مے بن، کچھ ہمارا خونبہا ساقی　　اس آبِ زندگی سے اپنے یاروں کو جلا ساقی

ٹک ایک تو رحم کر اب مر گئے مے کی تمنا میں　　ہماری خاک پر روتے ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

ارے زاہد نہیں بے دین و ایماں اہلِ میخانہ　　کہ ہے یاں بادۂ وحی و جامِ پیغمبر، خدا ساقی

بہار آئی ہے، پر افسوس، یہ دن کیا بھلے کٹتے　　جو ہوتا باغباں مخلص، ہمارا آشنا ساقی

بڑھاپے میں **یقیں** کے جامِ مے سے دستگیری کر
شرابِ کہنہ ہے اس دردِ پیری کی دوا ساقی

بہار آئی، بجاؤ، عندلیبو، سازِ عشرت کے　　گئیں حسرت کی وہ راتیں گئے وہ دن مصیبت کے

مزے سے عشق کے، دوزخ بھی اس فرقہ پہ جنت ہے　　خدا ہم کو کرے محشور امت میں محبت کے

تیری آنکھیں سبھوں سے آشنا ہیں اور کسی سے نہیں　　ہوئے جاتے ہیں دیوانے ہم اُس مانوس وحشت کے

بجا ہے آسماں آگے ہمارے گر زمیں ناپے　　کہیں پامال، سایہ کی طرح، خوباں کی قامت کے

بتاں اپنی جفا سیتی نہ گزریں، ہم وفا سیتی　　**یقیں**، ہم جان و دل سے معتقد ہیں اپنی ہمت کے

نہ دے برباد خارِ آشیاں کو عندلیباں کے
صبا، یہ بھی ہی خواہوں میں آخر ہیں گلستاں کے

نہ دی فرصت کہ ان ہاتھوں سے کچھ کام اور بھی نکلے
ہم آخر ہوگئے دامنگیر اس چاکِ گریباں کے

اُٹھینگی قمریاں محشر میں خاکستر ہماری سے
جلے ہیں ہم بہت ہاتھوں سے اس سروِ خراماں کے

رگڑتا ہی سر اپنا، پشتِ پا پر متصل تیرے
گریباں پھاڑیئے اس پر کیا طالع ہیں داماں کے

جو مجنوں آہوانِ دشت سے خوش تھا، تو وہ جانے
یقیںؔ، ہم تو دیوانے ہیں ان ہی تھری غزالاں کے

شروعِ عمر سے، ہم معتقد ہیں دشت دہاموں کے
بگولے کی طرح جاروب کش ہیں قبرِ مجنوں کے

جنھیں ہے ہوش، بیہوشی کے طالب ہیں، اگر دیکھو
چھُری ہے مے پرستی نام سے خُمِ فلاطوں کے

پریشاں خاک سے اُگتا ہے سنبل، اس سے ظاہر ہے
کھُلے ہیں موئے لیلیٰ اب تلک ماتم میں مجنوں کے

ہمیں مارِ سیاہِ زلف کے کاٹے سے کیا ہووے
کہ ہم ایک عمر سے عادی ہیں خالِ لب کی افیوں کے

نہیں ہے باغ سے کچھ کام خیر شمشاد و سرو ان کو
دیوانے ہیں، یقیںؔ، ہم قمریوں کی طبعِ موزوں کے

کہاں سکتے ہیں چڑھ مُنھ پر بتانِ نازوتمکیں کے
کہ ہیں ہم صبر کے بے خرچ، مفلس ہیں دل و دیں کے

بتوں کی بادشاہی کے سپہ سالار عاشق ہیں
بٹھائے کوہکن نے بیستوں میں نقش شیریں کے

ہمارا دل ہوا ہی خوں، ترے دامن کی ٹھوکر سے
گریباں گیر ہم ہووینگے اس دامانِ رنگیں کے

ملایا ہی دلوں کو خاک میں غفلت کے صدمہ سے
یہ شیشے قیمتی پھوڑے ہوئے ہیں خوابِ سنگیں کے

کیا تھا تکیہ، سنگِ آستانِ یار، مجنوں نے
ہمارا سر نہیں لائق یقیںؔ، اس نازِ بالیں کے

خبر کیا پوچھئے مرغِ چمن سے آشیانے کی — اسیروں کو توقع کب ہی پھر گلشن میں جانے کی

گئے پکڑے شروعِ گل میں در پرواز اول میں — نہ دی فرصت زمانہ نے ہمیں دھومیں مچانے کی

موا جاتا ہوں مت اتنا بھی کس کر گوندھ بالوں کو — ٹک ایک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیر اِس دِوانے کی

یہ لذت جس نے اپنے یار سے پائی ہی سو جانے — نشہ میں گالیاں کھانے کی اور پیالا پلانے کی

بہکتا ہی اس آب و تاب سے مستی میں پاؤں اُس کا
ڈھلک جس طرح ہوتی ہی یقیں موتی کے دانے کی

کوئی میداں نہ جیتا عشق کا فرہاد کے آگے — کسو نے دم نہ مارا تیشۂ فولاد کے آگے

گئے دوڑے نہ آخر، حضرتِ یعقوبؑ کنعاں سے — زمیں ناپے پدر بھی، حسنِ مادر زاد کے آگے

اکیلا کیونکہ لگتا بیستوں میں دل بچارے کا — نہ ہوتا نقشِ شیریں کا، اگر فرہاد کے آگے

اگر دھڑکا ہو جنت میں، تو بدتر ہی جہنم سے — ہمیں گل خار سا لگتا ہی اس صیاد کے آگے

یقیںؔ اُس قد کے آگے اس طرح سے سرنگوں ہے
درختانِ بیابانی ہیں جوں شمشاد کے آگے

محبت میں، مروت کی حکایت کے سخن خالی[1] — کہ جوں فانوس دل کی شمع بن ہی پیرہن خالی

رہے کب ہونگے اب تک بیستوں میں نقش شیریں کے — دل اپنا کس سے کرتا ہوگا یارو کوہکن خالی

گئی یہ کہہ کر آنے سے خزاں کے پیشتر بلبل — پھر ان آنکھوں سے کیونکر دیکھ سکیگا چمن خالی

---

[1] یہ مطلع یوں بھی آیا ہی:
دلِ بے کیونکہ ہو میرا بغیر اک منہرن خالی — تہی ہی شہر طفلاں سے غزالاں سے ہی بن خالی

موا آگے ہی جل کر شمع سے کیا خوب سمجھا تھا — نہ سکتا دیکھ پروانہ، سجن سے انجمن خالی

خسارت ہی یقیں، سرکار کی، اتنا سخن مت کر
نہ کر ان موتیوں سے جوں صدف اپنا دہن خالی

گلی تیری اگر پاوے تو بلبل گلستاں بھولے — ترا نقش قدم دیکھے تو اپنا آشیاں بھولے
جو کچھ دیکھا تجھے، اچھی طرح سے نقش خاطر ہے — وہ ٹھکیلی سے ہنسنا لاڈ سے رونا کہاں بھولے
کیا ہے داغ ایسا یار نے مجھکو، کہ یہ قصہ — سنے گر شمع، اپنے سوز دل کی داستاں بھولے
تو ایسا آدمی ہیگا کہ تجھکو گر پری دیکھے — سمجھ کر صورت معنی کو اپنا جسم و جاں بھولے

تو لڑکا تھا سجن، جب سے یقیں کو تیری آنکھوں کی
سیاہی و سپیدی دیکھ کر، پیر و جواں بھولے

شب ہجراں کی وحشت کو، تو اے بیداد کیا جانے — جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے، تیری بلا جانے
جدا ہم سے ہوا تھا ایک دن جو اپنے یاروں میں — خبر پھر کچھ نہ پائی کیا ہوا واقع خدا جانے
نہ رکھ، اے ابر، تو سر پر ہمارے بار منت کا — وہاں اور ہیں جو آگ کو دل کی بجھا جانے
نہ رکھ، اے دل، تو امید وفا ان بیوفاؤں سے — خدا سے ہی وہ بیگانہ، جو بت کو آشنا جانے

جنوں نے اس کے گل سے بلبلوں تک شور ڈالا ہے
یقیں سا ہو کوئی، تب اس طرح دھومیں مچا جانے

ہمیں ہجر چمن ہے موت، پر صیاد کیا جانے — جو گزرے سر پہ مقتولوں کے، وہ جلاد کیا جانے
دیوانہ ہوں، ہیں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا — مزے لے لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے

ہمیں کانٹا قفس کا، شاخِ گل ساجی میں چبھتا ہے
اسیری کے مزے کو بلبلِ آزاد کیا جانے

گلا تو پھٹ گیا نے کی طرح فریاد سے میرا
قیامت تو وہ ہے کس دن ملیگی داد کیا جانے

درختوں سے نہ دے تشبیہ اس قد کو یقیںؔ ہرگز
وہ اٹکھیلی سے چلنے کی طرح شمشاد کیا جانے

کوئی لطف ان تباں کا کیونکہ بن دیوانہ بن جانے
معانی نسخۂ گل کے غزل خوانِ چمن جانے

گریباں چاک کرنے سے ہمارے تجھ کو کیا ناصح
ہمارا ہاتھ جانے اور ہمارا پیرہن جانے

خطا ہے مفت مرکر، یار کو دینا رقیبوں کو
ہماری ہم سے پوچھو، کوہکن کی کوہکن جانے

فرماتے ہیں ہکلانے میں اس کے اور مت پوچھو
چپکنے کی لبوں کے وجہ شیریں دہن جانے

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے
وہ ہی سمجھے یقیںؔ یہ بات جو نبضِ سخن جانے

عبث پالی ہے سینہ بیچ، آہِ بے اثر ہم نے
یہ کیوں اس خاک میں بویا تھا نخلِ بے ثمر ہم نے

محبت میں بن آہ و شکِ ناصح کیونکہ جی سکئے
نہیں دیکھی ہے کوئی آگ بے دود و شرر ہم نے

نہ آیا کام شامِ غم ہمارے کے اثر تیرا
تری تقصیر کیا کی تھی ارے آہِ سحر ہم نے

نہ روئے ہجر میں پر وصل کے دن بہ چلے آنسو
اسی دن واسطے رکھے تھے گویا یہ گہر ہم نے

گلی میں دلربا کے چل یقیںؔ ڈھونڈیں دل اپنے کو
کہ مدت سے نہیں لی اس دیوانے کی خبر ہم نے

ضرر اس سے مقرر کیا کیا تھا باغباں تو نے
جلا ناحق دیا ان بلبلوں کا آشیاں تو نے

اگر دعویٰ نہ کرتا عشق کا، بدنام کیوں ہوتا ‌ ‌ ‌ زبانوں میں مجھے عالم کے ڈالا ہے زباں تو نے

بگولا بھی ہماری خاک سے اب اُٹھ نہیں سکتا ‌ ‌ ‌ ہمیں یوں کر دیا پامال، اے سروِ رواں تو نے

مرے آنسو بھی، مارے ضعف کے، اب چل نہیں سکتے ‌ ‌ ‌ کیا، اے عشق، مجھکو، ہائے، ایسا ناتواں تو نے

یقیں، بلبل کہاں ہوتا ہے پیدا اس سلیقہ کا

کیا ہے منتخب خوباں کے مُنھ کا گلستاں تو نے

یہ وہ آنسو ہیں جن سے زہرہ، آتش ناک ہو جاوے ‌ ‌ ‌ اگر بیوے کوئی ان کو تو جل کر خاک ہو جاوے

نہ جا گلشن میں، بلبل کو خجل مت کر، کہ ڈرتا ہوں ‌ ‌ ‌ یہ دامن دیکھ کر گل کا گریباں چاک ہو جاوے

گنہگاروں کو ہے اُمید اس اشکِ ندامت سے ‌ ‌ ‌ کہ دامن شاید اس آبِ رواں سے پاک ہو جاوے

عجب کیا ہے تری خشکی کی شامت سے، جو تو زاہد ‌ ‌ ‌ نہالِ تاک بٹھلاوے تو وہ مسواک ہو جاوے

دعا مستوں کی کہتے ہیں، یقیں، تاثیر رکھتی ہے

الٰہی، سبزہ جتنا ہے جہاں میں، تاک ہو جاوے

نہیں کوئی کہ دشنام اس کی ہم تک یاد علاوے ‌ ‌ ‌ گیا ہے دل، اب اُس کو دیکھئے کب تک خدا لاوے

پڑیں پتھر، الٰہی، اس محبت پر، کہ وہ بیکس ‌ ‌ ‌ مرے اس طرح اوپر یہ، نہ تیشے کو اُٹھا لاوے

جو کچھ آباد ویرانہ کو ہم نے کر دیا، کب تھا ‌ ‌ ‌ کسی کو شبہ گر ہووے تو مجنوں کو دکھلا دے

دیارِ حسن تو خوش ہے، ولیکن یہ بڑی مشکل ‌ ‌ ‌ کہ لٹ جاتا ہے یہاں جو کارواں جنسِ وفا لاوے

مناسب نہیں ہے شکوہ جور کا ان خوبرویوں سے

یقیں، کوئی بُری باتوں کو اچھے منھ پہ کیا لاوے

مقابلہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے کہو کسی کا کوئی کیوں کہ آشنا ہووے
دیت کا نام نہ لیجئے، خدا کرے کہ کہیں دیئے سے جی کے بھی قاتل کا حق ادا ہووے
اگرچہ ہمیں یاد کر نہیں سکتا کبھو بُرا ہی ہمیں کہہ کہ تیرا بھلا ہووے
یہ سب تو کرتے ہیں دعوئے عشق، یار کہیں جو آزمانے پہ آوے، بڑا مزا ہووے

یقیں ہوا مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم
نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

کیا دل ہے اگر جلوہ گہِ یار نہ ہووے ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے
کچھ رنگ نہیں نغمہ و آہنگ میں اُس کے بلبل جو بہاراں میں گرفتار نہ ہووے
دل جل جو گیا، خوب ہوا، سوختہ بہتر وہ جنس کہ کوئی جس کا خریدار نہ ہووے
شمشاد کو دیوے ہے قضا دار کے تجھ پہ جو جامہ ترے قد پہ سزاوار نہ ہووے

نہیں باغِ محبت میں یقیں اُس کو کہیں جا[1]
جس دل میں کہ داغوں ستی گلزار نہ ہووے

وفا کا، کیا قیامت ہے، جو کوئی بدلہ جفا دیوے ترحم ان بتوں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے
نہ تھی پرواز قسمت میں مرے صیاد، پر اتنا صبا سے کہیو میری خاک گلشن میں اڑا دیوے

---

[1] دو قلمی نسخوں میں یہ مقطع اس طرح سے بھی ہے:
منظور یقیں کس کو حقیقت کے معانی :: طاؤس اگر زینتِ دلدار نہ ہووے
تب بوجھے یقیں طبع کی صحت تری، ناصح ان آنکھوں کے تئیں دیکھ جو بیمار نہ ہووے

خفا ہو زندگی سے، مر گیا ہوں، تسپہ ڈرتا ہوں
مبادا حشر مجھکو خوابِ راحت سے جگا دیوے

محبت کا جو ماتا ہے، عجب آداب ہیں اُس کے
کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں، عاشق دعا دیوے

یقیں زنجیر میں ہے، تب تو عالم میں نہیں چھلیں
جو ٹک چھوٹے یہ دیوانہ، ابھی دھومیں مچا دیوے

اگر دینی ہو دل کی داد، جتنا اس کا جی چاہے
تو کرنے دو اُسے فریاد، جتنا اس کا جی چاہے

ملی ہیں یار کی گلیاں ہمیں، مجنوں سے یہ کہیو
کرے ویرانہ کو آباد، جتنا اس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جائیں چھوڑ بت خانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد، جتنا اس کا جی چاہے

وفا کا طوق ہے قمری صفت جزوِ بدن میرا
کرے جور و ستم صیاد، جتنا اس کا جی چاہے

یقیں، مجھ بن نہیں ہے قدرداں کوئی مصیبت کا
فلک مجھ پر کرے بیداد، جتنا اس کا جی چاہے

یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
کون اس کوچہ میں جز تیر گزر کرتا ہے

اب تو کر لے نگہِ لطف کہ ہو توشہ راہ
کہ کوئی دم میں یہ بیمار سفر کرتا ہے

اپنی حیرانی کو ہم عرض کریں کس مُنہ سے
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے

عمر فریاد میں برباد گئی، کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور خطا ہے کہ اثر کرتا ہے

یار کی بات ہمیں کون سُناتا ہے یقیں
کون، کب، گل کی، دیوانوں کو خبر کرتا ہے

چلا آنکھوں سے جب کشتی میں وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں، کبھی جی ڈوب جاتا ہے

کہو کیوں کر نہ پھر ہووے گا دل روشن زلیخا کا
جہاں یوسف سا نورِ دیدۂ یعقوب جاتا ہے

جہاں کے خوبرو مجھ سے چرائیں کیوں نہ پھر انکھیں
جو کوئی خورشید کو دیکھے سو وہ محجوب ہوتا ہے

مرا آنسو بھی قاصد کی طرح ایک دم نہیں رکتا
کسی بیتاب کا گویا لئے مکتوب جاتا ہے

یقیںؔ ہرگز کیا مت کر اتنی تعریف لڑکوں کی
اسی باتوں ستی مضمون سا محبوب جاتا ہے

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نِرا بُرا نہیں یہ شغل، کچھ بھلا بھی ہے

اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے سجن، خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے مَلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یقیںؔ کا شور جنوں سن کے، یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

نپٹ سونی ہیں گلیاں، خاطرِ طفلاں پریشاں ہے
کہو مجنوں کو، تجھ بن خانۂ زنجیر ویراں ہے

نگاہِ یار کی کوئی زباں اب تک نہیں سمجھا
یہ وہ باتیں ہیں نازک جن سے آئینہ بھی حیراں ہے

نکل بھاگا ہے کوئی صید کیا اس دام سے سچ کہہ
کئی دن ہیں کہ تیری زلف کی خاطر پریشاں ہے

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی، تو کیا ہوگا
بہار آنے دو، میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

یقیںؔ، دیکھ اس تجلی کی جلالی اور جمالی کو
گلی ان گلرخاں کی خونِ ناحق سے گلستاں ہے

کرتے ہیں، اپنے بال دکھا، مبتلا مجھے
اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے

دل نے میرے جو دی ہر بڑا، ٹوٹنے کی قدر
کرتی ہے بال بال سے چینی دعا مجھے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
ذلتی کرتے تو کی، پہ راس نہ آئی وفا مجھے

میں خاک تو ہوا پہ میری آبرو رہی
نہیں کرتے تھے دیدہ خوار جدا، دل جدا مجھے

میں گر رہا ہوں یار کے قدموں اوپر یقیںؔ
آئی ہے راس سایۂ گل کی ہوا مجھے

عشق تیرے سے لگاوے نہ خدا عار مجھے
نہ کرے دام رہائی میں گرفتار مجھے

حسن اور عشق میں ایک طور سے نسبت ہے ضرور
چشم بیمار تجھے دی ہے، دلِ زار مجھے

یار آیا، پہ مجھے ہوش نہ تھا کیا کہیئے
نہ کیا اس دلِ دشمن نے خبردار مجھے

سنگِ طفلاں کی میں امید پہ ہوں دیوانہ
تسپہ دیتے ہیں تغافل سے یہ آزار مجھے

جب سے نظارہ کیا ترک، ہوا ہوں دل سرد
گرم رکھتا تھا یقیںؔ، شعلۂ دیدار مجھے

ان پری زاد جوانوں نے کیا پیر مجھے
کر دیا ضعف سے جوں سایہ، زمیں گیر مجھے

تیری تدبیر سے میں کیوں کہ مروں گا، اے مرگ
کی نہ ہو ہجر کے جب زہر نے تاثیر مجھے

جس کو منظور ہے مرنا، اسے جینا ہے وبال
ہے دمِ پاک مسیحا، دمِ شمشیر مجھے

مجھکو پیری میں کیا تازہ جوانوں کا مرید
خوار کرتا ہے یہ نظارۂ بے پیر مجھے

کم نہیں جوہر فولاد، جواہر سے یقیںؔ
ہے بہ از سلکِ گوہر عشق میں زنجیر مجھے

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے — جی ہی آخر لے کے چھوڑے گی یہ بیماری مجھے

کب ہوس ہے مجھکو رسوائی کی لیکن کیا کروں — کھینچکر لاتی ہے اس کوچہ میں لاچاری مجھے

میں جو بن غمخوار ہرگز جی نہ سکتا تھا کبھو — ان نوں کرنی پڑی ہے دل کی غمخواری مجھے

عشق کے فن سے ابھی مجھکو کہاں ہے اطلاع — کچھ نہیں آتا بغیر از نالہ و زاری مجھے

کیا لگا لیتا ہے خوباں کو یقیں کرتی ہے داغ
آئینہ کی سادہ لوحی ساتھ پرکاری مجھے

دکھ تو دیتا ہے کروں میں تجھکو حیراں تو سہی — باغباں اب کے اجاڑے تو گلستاں تو سہی

ابر میں دیتا نہیں تو مجھکو اے ساقی شراب — میں کروں شیشہ کو تیرے سنگ باراں تو سہی

اب تو ناصح کے تئیں سینے دو میرا چاک جیب — تار تار اس ضد سے کردوں میں گریباں تو سہی

لوگ کب خاطر میں لاتے ہیں میرے ویرانہ کو — اشک خوں سے باغ کر ڈالوں بیاباں تو سہی

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیں
ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

محبت کے مزوں کو کب ہر ایک پیر و جواں سمجھے — جو ابراہیم ہو آتشکدہ کو گلستاں سمجھے

ستم ہے قید کرنا اس طرح سے مرغ ناداں کو — کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے

نہیں آنکھوں سے تیری حال میرا کچھ چھپا ہر گز — جو کوئی بیمار ہو سو قدر جان ناتواں سمجھے

انھیں سرو چمن کی طرح اپنے سر پہ بٹھلاوے — جو اپنی قمریوں کی قدر وہ سرو رواں سمجھے

یقیں کی گفتگو کے لطف کو باللہ کب کوئی — بغیر از حضرت استاد مرزا جان جاں سمجھے

یہ دل مملوک ہی خوباں کا کون اس کو چھپا رکھے
بغل میں کیوں کہ ماں بادشاہی کو دبا رکھے
بتاں کی گرم جوشی صبر کے خرمن کی آتش ہے
خدا اس قوم کو بیگانگی کا آشنا رکھے
حرم کو چھوڑ، دل بے طرح بت خانہ پہ چلتا ہی
توقع باز رکھنے کی نہیں اس کو خدا رکھے
ہمیں دوزخ سے اتنا مت ڈرا زاہد کہ ظاہر ہے
خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے
یقیںؔ جاتا رہا گر بلبلوں کے ساتھ، جانے دو
کوئی اس بے مروت دل کو اپنے پاس کیا رکھے

شکن مشتاق دل میرا ہوا ہی سخت سودائی
جہاں یہ دیکھتا ہی سنگ وہاں کرتا ہی مینائی
سکوت اہلِ سخن کا بھی نہیں خالی افادہ سے
قلم کی طرح خاموشی میں یہ رکھتا ہی گویائی
زمیں پر جس طرح گرتا ہی سایہ، سرو رعنا کا
تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہی رعنائی
نہیں ہوتی کبھو احباب کی خاطر ملول اس سے
خدا شاہد عجب بے بد مصاحب ہی یہ تنہائی
یقیںؔ بیجا ہی میں کرتا ہوں بے صبری کو ڈرتا ہوں
محبت بیچ لگ جاوے کہاں ننگِ شکیبائی

ٹک ایک انصاف کر اتنی بھی کرتا ہی جفا کوئی
کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی
نظر آتا نہیں ثابت، گریباں ایک غنچہ کا
چمن پر یہ ستم کرتا ہی اے بادِ صبا کوئی
گل و لالہ سے شور انگیز تر ہیگی حنا تیری
نہ ہو دیوانہ کیوں کر دیکھ تیرے دست و پا کوئی
عجب سج سے کیا ہی قتل مجھکو اس کو مت ٹوکو
طلب کرتا ہی ایسے قاتلوں سے خوں بہا کوئی
گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اس کی
محبت میں یقیںؔ لیتا ہی نام مدعا کوئی

گئے سب بھول شکوے، دیکھ روئے یار، کیا کہیے — زباں حیرت سے میری ہو گئی بے کار، کیا کہیے

تبسم میں جو اس کا منھ کھلا، دل بند ہو گیا وہیں — میرا دل لے گیا ہنستے ہی ہنستے یار، کیا کہیے

اگر اس کی جگہ پہلو میں ہوتا خار، بہتر تھا — بہت دیتا ہی میرا دل مجھے آزار، کیا کہیے

جلا کر آشیاں اس فصلِ گل میں، باغباں میرا — جہنم، تو نے مجھ پر کر دیا، گلزار کیا کہیے

یقیں کے واقعہ کی سن خبر، وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ تو کچھ ایسا نہ تھا بیمار، کیا کہیے

زنجیر میں بالوں کی پھنس جانے کو کیا کہیے — کیا کام کیا دل نے، دیوانہ کو کیا کہیے

عاشق جو رہے جلتا، معشوق کے کام آوے — کیا لطف ہے جل جانا، پروانے کو کیا کہیے

دل چھوڑ گیا ہم کو، دلبر سے توقع کیا — اپنے نے کیا یہ کچھ، بیگانے کو کیا کہیے

تحقیق کو ظالم نے، ٹک کام نہ فرمایا — فرہاد کے اس ناحق مر جانے کو کیا کہیے

صحرا میں، یقیں، آہو کیا جو رسے پھرتے ہیں
فردوس نہ کہیے تو ویرانے کو کیا کہیے

تمت